سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

مومن کون ہے۔ مومن دراصل وہ ہے جو اِس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک، ظاہرِ حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا، آخرِ حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے ——

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (روم - ۷)

شمارہ ۱۳ — زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے — قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
دسمبر ۱۹۷۷ — بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی — دو روپے

فہرست

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم سالانہ زرتعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جاسکے ــــــ مینجر

اداریہ

"الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بناؤ۔ تاکہ اس کی مقبولیت بڑھے اور عوامی تعاون کے ذریعہ اس کو چلایا جاسکے" ــــــ ہمارے جو ہمدرد اس قسم کی تجویزیں بھیج رہے ہیں، ان کی نیت خواہ کتنی ہی اچھی ہو، اس بے رحم دنیا میں بہرحال وہ قابل عمل نہیں۔ اس تجویز کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دعوت حق کے اخراجات کو مدعو سے وصول کیا جائے۔ مگر ہمارے ہمدردوں کو جاننا چاہئے کہ کپڑے اور صابن کی قیمت اس کے صارفین بخوشی دینے کے لئے تیار ہوسکتے ہیں، لیکن دعوتِ حق کا بل مدعو سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر وصول ہوسکتا ہے تو صرف جزوی شکل میں۔

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو خالص حق کی سطح پر چلتی ہیں۔ دوسری وہ جو عوامی ذوق کی سطح پر چلائی جاتی ہیں۔ عوامی ذوق کی سطح پر چلنے والی تحریکیں بہت جلد عوام میں یا کم از کم اس کے قابل لحاظ حصہ میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کو ان کی پسندیدہ چاشنی دے رہی ہوتی ہیں۔ برکت کی چاشنی، سیاست کی چاشنی، تفریح کی چاشنی، سطحیت کی چاشنی، وغیرہ۔ الرسالہ میں اس قسم کی کوئی چاشنی پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ الرسالہ کا مقصد یہ ہے کہ بے آمیز حق کو لوگوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ اگر اپنے مدعو سے "اجر" کی توقع کرے تو وہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کی اصل دعوت میں "تکلف" کرکے اس کو عام پسند بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی کوشش الرسالہ کی مقصدی حیثیت کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوگی:

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ ۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (ص - ۸۶)

کہو میں اس کام پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اور میں بناوٹ کرنے
والوں میں نہیں ہوں (لا ازید علیہ ولا انقص منہ،
ابن کثیر) یہ تو صرف نصیحت ہے سارے عالم کے لئے۔

اس قسم کی تحریکیں ہمیشہ خواص کے تعاون سے چلتی
ہیں نہ کہ عوام کے تعاون سے۔ مکہ میں اسلامی تحریک زیادہ تر
دو تاجروں کے مالی تعاون سے چلتی رہی۔ ایک خدیجہ بنت
خویلد، دوسرے ابوبکر بن ابی قحافہ۔ یہی آج بھی ہوگا۔
الرسالہ کی آواز اگر کچھ خواص کے اندر یہ حرارت پیدا کر سکے
کہ وہ مالیاتی قربانی کی حد تک اعلان حق کی اس اسکیم کے ساتھ
تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو یقیناً وہ جاری رہے گا۔
اور اگر خدانخواستہ اس کے برعکس صورت پیش آئی تو مذکورہ
بالا قسم کی تجویزیں اس کو چلانے والی نہیں بن سکتیں۔ ایسی کسی
تجویز میں اس "۲۵ پیسے" کے بقدر افادیت بھی نہیں ہے
جس سے ہمارا ایک ہمدرد ڈاک خانہ سے لفافہ خریدتا ہے
اور اپنی تجویز کو اس میں ملفوف کرکے ہمارے نام روانہ کرتا ہے۔

ہمارے ہمدردوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ الرسالہ
کے اجراء کا مقصد کوئی صحافتی چاٹ ہاؤس کھولنا یا ادبی
شیرین بھون قائم کرنا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم "صحافت"
اور "ادب" جیسے الحاقات کے بغیر اس کو کرنا زیادہ پسند
کرتے۔ الرسالہ دراصل وقت کے معیارِ فکر پر اسلام کو اس
کا مقام دلانے کی کوشش ہے۔ یہ دور جدید کی سطح پر اسلام
کو از سر نو زندہ کرنے کی ایک مہم ہے۔ اس قسم کی آواز کو سمجھنے
اور اس کو لے کر آگے بڑھنے والے قرآن کے الفاظ میں "ملأ قوم"
ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الرسالہ کے مخاطب اصلاً
عوام نہیں ہیں۔ بلکہ قوم کا وہ باشعور طبقہ ہے جو باتوں کو اس
کی گہرائی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور عملی یا فکری طور پر
عوام الناس کو اپنے ساتھ چلاتا ہے۔ عوام کے لئے قابل مطالعہ
بنانے کی خاطر الرسالہ کے معیار کو بدلنا خواص کے لئے اس کو
ناقابل مطالعہ بنانے کے ہم معنی ہوگا۔ اور یہ قربانی بہر حال
کسی طرح نہیں دی جا سکتی۔

ہمارے لئے عملاً اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں
کہ الرسالہ کو نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر چلائیں کیونکہ الرسالہ
کا مخاطب سب سے زیادہ جو گروہ ہے، وہ وہی ہے جو کسی
رسالہ یا کتاب کو خرید کر پڑھنے میں ہمیشہ سب سے پیچھے ہوتا
ہے۔ دوسرے لفظوں میں الرسالہ کے خریداروں کی تعداد
بالفرض بہت بڑھ جائے، تب بھی کم از کم ابتدائی کچھ برسوں
تک، وہ خسارہ ہی پر چلے گا۔ اس خسارہ کو کون پورا کرے۔
اس قسم کی فکری مہم کے خسارہ کو پورا کرنے والے پہلے بھی چند
دردمند لوگ ہوتے تھے، آج بھی ایسے ہی کچھ لوگ ہوں گے۔
الرسالہ اگر اپنے پیچھے دردمندوں کی ایسی تعداد جمع نہ کر سکے تو
اس کو بند کر دینا اس سے بہتر ہے کہ دوسرے جرائد کی طرح
اس کو عوامی ذوق کی دکان بنا دیا جائے۔

الرسالہ کے جو ہمدرد ہمیں اس قسم کی تجویزیں بھیج رہے ہیں
کہ الرسالہ کے معیار کو عوامی بناؤ تاکہ عوامی خریداری میں اضافہ
ہو سکے ان سے ہم کہیں گے کہ الرسالہ کے ساتھ آپ کی زیادہ بڑی
خیر خواہی یہ ہوگی کہ آپ اپنی تنہائیوں میں یہ دعا کریں کہ خدایا!
الرسالہ کے موجودہ علمی معیار کو برقرار رکھ، بلکہ اس کو اور زیادہ
بلند کر تاکہ وہ خواص امت کے لئے قابل مطالعہ بن سکے اور کچھ
صاحب خیر افراد کو اس کی مدد کے لئے کھڑا کر دے تاکہ نفع نقصان
سے بے نیاز ہو کر وہ امت کے باشعور اور تعلیم یافتہ افراد تک حق
کا پیغام پہنچانے کا کام جاری رکھے

الرسالہ کی کامیابی یہ ہے کہ امت کے باشعور طبقہ تک
اسلام کا اصل پیغام مؤثر شکل میں پہنچا دے، خواہ یہ طبقہ اس کا
کوئی "اجر" دینے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو۔

ایک بزرگ راستہ چل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے معتقدین کی ایک بڑی جماعت تھی۔ راستہ میں ایک فقیر نے روکا:

"آپ نے بہت کچھ پڑھا اور جانا ہوگا۔ ایک بات میری بھی سن لیجئے"۔ اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولا: "سنئے! وہاں کسی کی ساری پوتھی نہیں دیکھیں گے۔ آدمی سچ مچ جہاں ہے، بس وہیں انگلی رکھ دی جائے گی"۔ اتنا کہا اور خاموشی سے غائب ہوگیا۔

آدمی لوگوں کے درمیان اس سے جانا جاتا ہے کہ وہ مقرر ہے، مصنف ہے، فلاں عہدے اس کے پاس ہیں۔ فلاں فلاں ملکوں کی اس نے سیاحت کی ہے۔ اتنے آدمیوں کی جماعت اس کے ساتھ ہے۔ اس نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وغیرہ۔ مگر اکثر یہ تمام چیزیں مصنوعی ہوتی ہیں۔ انسان حقیقۃً کہیں اور ہوتا ہے، مگر دیکھنے میں کہیں اور نظر آتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں اپنی ذات کے گرد گھومتی ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے دین کے لئے سرگرم عمل ہے۔

کوئی انسان کہاں ہے، یہ ہم نہیں جان سکتے۔ مگر خدا اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آخرت میں کسی آدمی کی زندگی کے ٹھیک اسی مقام پر وہ انگلی رکھ دے گا جہاں وہ حقیقۃً جی رہا تھا۔

ایک وزیر اعظم جب اقتدار کی کرسی پر ہو تو ملک کی تمام رونقیں اس کے جلو میں چلتی ہیں۔ ہر طرف بس اسی کے شاندار کارناموں کی دھوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس سے بڑھ کر انسانیت کا پیکر اور کوئی نہیں۔ مگر جب عوام کی عدالت اس کو بے نقاب کرتی ہے اور اس کو مصنوعی رونقوں کے تخت سے اتار کر وہاں رکھ دیتی ہے جہاں وہ فی الواقع تھا تو اچانک دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی بظاہر روشن زندگی مکمل طور پر ایک تاریک زندگی تھی۔ وہ تمام تر اپنی ذات کی سطح پر جی رہا تھا۔ اگرچہ اس کے تحت ابلاغ کے تمام محکمے رات دن اس پروپگنڈے میں مصروف تھے کہ وہ خدمت قوم اور تعمیر ملک کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔

تاریخ کے انقلابات

فلکی طبیعیات کے مطابق ایک عظیم دھماکہ (BIG BANG) نے عالم طبیعی کو اس کی مقررہ شاہراہ پر ڈالا تھا۔ پیغمبر اسلام کی آمد اس دنیا کا دوسرا عظیم دھماکہ ہے جس نے عالم انسانی کو اس کی مقررہ شاہراہ پر ڈال دیا۔ اس سلسلہ کا تیسرا دھماکا وہ ہے جس کو علمی انفجار (KNOWLEDGE EXPLOSION) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسرار فطرت کے انکشاف نے ان غیبی حقائق کو علمی طور پر قابل فہم بنا دیا جس کو پیغمبروں نے الہامی طور پر کھولا تھا۔ کائنات کے تین اہم ترین واقعات ہیں جن کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

فتق کائنات (انبیاء — ۳۰)

اظہار دین (فتح — ۲۸)

آیات آفاق و انفس کا ظہور (فصلت — ۵۳)

قرآن کے مطابق کائنات ابتداءً حالتِ رتق میں تھی، اللہ نے اس کا فتق کیا۔ یہ گویا پہلا عظیم دھماکہ تھا جو فلکی طبیعیات کے اندازہ کے مطابق ۱۰ بلین سال پہلے پیش آیا۔ اس نے کائنات کے اندرونی طور پر جڑے ہوئے مادہ کو بیرنی سمت میں حرکت دے دی۔ مادہ پھیلنا شروع ہوا اور بالآخر وہ پوری کائنات اور نظام شمسی وجود میں آئے جن سے آج ہم واقف ہیں۔ بائبل کی روایات کے مطابق اب سے آٹھ ہزار سال قبل جب پہلے انسان (آدم) پیدا کئے گئے اور عراق میں دجلہ و فرات کے درمیان (پیدائش ۲ : ۱۴) میں آباد ہوئے تو وہ دنیا آخری طور پر بن کر تیار ہو چکی تھی جس میں وہ سب کچھ مکمل طور پر موجود ہے جو انسان کو اپنی ضرورتوں کے لئے درکار ہو سکتا ہے۔ (ابراہیم — ۳۴) علم الانسان کے ماہرین کے اندازہ کے مطابق انسان کے ظہور سے اب تک تقریباً ایک سو ارب (ایک کھرب) انسان زمین پر پیدا ہو چکے ہیں۔

مادی ضرورتوں کے لئے انسان کو ایک مکمل کائنات حاصل ہو گئی۔ اب اس کو ضرورت ایک ایسے ہدایت نامہ کی تھی جس کی روشنی میں وہ اپنے لئے حیات طیبہ (نحل — ۹۷) کی تعمیر کر سکے۔ پہلی چیز اگر نعمت ظاہری تھی تو دوسری چیز نعمت باطنی (لقمان — ۲۰)۔ اللہ نے یہاں قلم (علق — ۴) کا ذریعہ اختیار کیا۔ اس نے انسان کی اس دوسری ضرورت کی تکمیل کے لئے اس کے پاس وہ ابدی ہدایات بھیج دیں جن کی روشنی میں وہ اپنی سرگرمیوں کے لئے صحیح نقطۂ آغاز کو پا لے اور وہ بنیادی اصول اس کو مل جائیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی کو ترتیب دے سکے۔ چنانچہ آدم جب زمین پر آئے تو وہ خدا کی یہ رہنمائی بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آدم نے ان تعلیمات کو کچی مٹی کی تختیوں پر لکھا اور پھر ان کو پکا کر اپنے خاندان میں محفوظ کر دیا۔ مگر ان کی اگلی نسل ان کی حفاظت نہ کر سکی۔ اللہ نے دوسرے نبی کے ذریعہ دوبارہ اپنی تعلیمات کو اتارا۔ مگر انسان نے پھر ان کو ضائع کر دیا۔ آدم کے بعد ادریس، نوح، ابراہیم، اسرائیل، موسیٰ (علیہم السلام) اور ان کی اولاد میں کثیر تعداد میں پیغمبر آئے اور خدا کی طرف سے تختیاں اور کتاب (فاطر — ۲۵) انسان کے حوالے کرتے رہے۔ مگر بار بار یہی ہوا کہ اگلی نسلیں ان کی حفاظت میں ناکام رہیں۔ کبھی ان کے علماء نے کتاب اللہ میں اپنی باتیں اس طرح ملا دیں کہ دونوں کو الگ کرنا ناممکن ہو گیا۔ (تورات) کبھی اصل متن غائب

ہوگیا اور صرف اس کا ترجمہ باقی رہ گیا (انجیل) ۔ کبھی کسی ارضی یا سماوی آفت میں کتاب ضائع ہوگئی (صحیفہ ابراہیم) اس طرح انسان اس اعتماد میں پورا نہ اترا کہ وہ بطور خود کتاب الٰہی کا محافظ (مائدہ ۔ ۴۴) بن سکے۔ بالآخر اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق فیصلہ کیا کہ کتاب اتارنے کے ساتھ وہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لے لے (حجر ۔ ۹) تاکہ انسان کے اوپر جس طرح نعمت مادی کا اتمام ہوا ہے، نعمت ہدایت کا بھی اس کے اوپر یقینی اتمام ہو جائے (نحل ۔ ۸۱)

ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کی بعثت خدا کا دوسرا دھماکہ تھا۔ فاران (استثنا ۳۳ : ۲) کے علاقہ بکہ (زبور ۸۴ : ۶) میں بنی اسرائیل کے بھائی (استثنا ۔ ۱۸ : ۱۸) بنی اسماعیل میں آتشیں شریعت (استثنا ۳۳ : ۲) والا رسول بھیجا گیا۔ اللہ نے اس کے لئے مقدر کر دیا کہ اس کو نہ زوال نہ ہوگا اور نہ وہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کر لے (یسعیاہ ۴۲ : ۴) ۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: خدا اس رسول کے ذریعہ اپنے دین کو غالب کرے گا اور اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا، خواہ یہ کافروں اور مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو (برارۃ، فتح، صف)۔ اتمام نور سے مراد قرآن کو اتارنے کے بعد اس کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دینا ہے۔ اور "غلبہ" سے مراد اس کی پشت پر ایسی طاقت جمع کر دینا ہے جو اس میں تحریف و تبدیلی کی ہر کوشش کو ناممکن بنا دے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ "آج منکرین تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے، اس لئے تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا (مائدہ ۔ ۳) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے جو دین آئے وہ ناقص دین تھے اور اسلام مکمل دین ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے پاس کبھی کوئی ناقص دین نہیں بھیجا۔ اسلام کے کامل ہونے کا تعلق اس کی حفاظت سے ہے نہ کہ فہرست احکام سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب دین کو اپنی صحیح شکل میں اتارنے کے ساتھ مزید یہ تکمیلی اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کی پشت پر قوت بھی جمع کر دی گئی ہے تاکہ کوئی منکر یا غیر منکر اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہی بات دوسری جگہ ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اور تیرے رب کا کلام پورا ہو گیا صداقت اور انصاف میں، اب کوئی اس کلام کو بدلنے والا نہیں (انعام ۔ ۱۱۵)

قدیم زمانہ میں قرآن میں مذکور تقریباً دو درجن اور بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبروں کے آنے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ دین خداوندی کی پشت پر ایسی اجتماعی قوت جمع ہوتی جو انسانی زندگی میں مطلوبہ انقلاب برپا کرتی۔ اللہ نے **آخری رسول** کے ذریعہ یہ کیا کہ اپنے دین کو غالب کر کے اس کو قیامت تک کے لئے ایک تاریخی واقعہ بنا دیا جب کہ اس سے پہلے وہ **افسانوی روایات** کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ بائبل کے الفاظ میں "خداوند کا روز عظیم"، (صفنیاہ ۱ : ۱۴) تاریخ کا یہی لمحہ تھا جب کہ انسانی تاریخ کو اس کے مطلوبہ رخ کی طرف بجبر موڑ دیا گیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے کتاب الٰہی کو مدون کر کے اس کو ایک عظیم امت کے حوالے کیا، جو اس کو لے کر انتہائی حفاظت کے ساتھ نسل در نسل چلتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کو دور پریس میں پہنچا دیا جس کے بعد اس کے ضیاع یا تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

متن قرآن کی حفاظت کی اہمیت کیا ہے، اس کو ان اسلامی فرقوں کے مطالعہ سے سمجھا جا سکتا ہے جو بعد کے دور میں

اسلام کے اندر پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر شیعہ اور صوفیاء کو لیجئے۔ شیعیت ابتداءً اگرچہ سیاسی محرک کے تحت پیدا ہوئی اور تصوف روحانی محرک کے تحت، تاہم دونوں اپنے آپ کو اسلام کے صحیح ترین نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق کسی کی نجات ان کے طریقے کو اختیار کئے بغیر ممکن نہیں۔ مگر ایک شخص جب ان دونوں کے عقائد و خیالات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ ان کے مزعومات اور طریقوں کا قرآن کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ شیعیت اور تصوف دونوں اگرچہ قرآن ہی کا حوالہ دیتے ہیں، مگر ایک غیر جانب دار مبصر کے لئے دونوں متوازی مذاہب ہیں جو قرآن کے بالمقابل قرآن کے نام پر کھڑے کر لئے گئے ہیں۔ اگر قرآن کا متن اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ ہوتا تو اسلام انسانی آمیزشوں کا شکار ہو کر اتنی مختلف شکل اختیار کر لیتا کہ کسی بندۂ خدا کے لئے اپنے رب کی مرضی کو جاننا ہی ناممکن ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ متن قرآن کی حفاظت اتنی ہی اہم ہے جتنا قوانین فطرت کا استحکام۔ قوانین فطرت میں اگر استحکام نہ ہوتا تو سائنس وجود میں نہ آتی، اسی طرح متن قرآن اگر محفوظ نہ ہوتا تو خدا پرستی ساری دنیا کے لئے ایک لامعلوم چیز بن جاتی۔

انسان کو زمین کا خلیفہ (بااقتدار) بنا کر پیدا کیا گیا ہے (بقرہ۔ ۳۰)۔ اقتدار و اختیار کا مالک ہونے کی وجہ سے ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ وہ بگڑ جائے اور خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے لگے۔ اس سے بچنے کے لئے انسان کو خصوصی طور پر اسماء کا علم (بقرہ۔ ۳۱) دیا گیا۔ اسماء سے مراد اللہ کے نام، بالفاظ دیگر اس کی وہ جھلکیاں ہیں جو اس کی پیدا کی ہوئی کائنات میں ہر طرف نقش ہیں۔ اللہ کا یہ تعارف ہر چیز سے اس طرح ابلا پڑ رہا ہے گویا کہ تمام چیزیں خدا کی تسبیح پڑھ رہی ہوں (حشر۔ آخر)۔ "آدم کو سارے نام سکھا دیئے" (بقرہ۔ ۳۱) کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ صلاحیت دے دی کہ وہ ہر چیز میں خدا کا نام پڑھ لے، ہر چیز میں اپنے خالق کا جلوہ دیکھ لے۔ انسان کو سننے، دیکھنے اور سوچنے کی جو اعلیٰ صلاحیتیں دی گئی ہیں، ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو وہ چڑیوں کے چہچہے میں خدا کا ذکر سنے گا، پھول کی رنگینیوں میں خدا کا جلوہ دیکھے گا۔ کائنات اس کے لئے خدا کے انتہاہ کرشموں کا آئینہ بن جائے گی۔ اگر آدمی اپنے کو اندھا بہرہ (اعراف۔ ۱۷۹) نہ بنالے تو اسماء الٰہی کا یہ علم اس کو ہر قسم کے بگاڑ سے بچانے کے لئے بالکل کافی ہے۔ جو خادم ہر آن اپنے آقا کی عظمتوں اور قدرتوں کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔

کائنات میں اللہ کے یہ تمام "نام" اول دن سے لکھے ہوئے ہیں اور اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے انسان ہمیشہ اس قابل رہا ہے کہ وہ ان ناموں کو "پڑھ" سکے۔ مگر جیسا کہ آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵۔ ۱۸۸۹) نے لکھا ہے، انسان اپنی مظاہر پرستی کی وجہ سے اپنے طویل ماضی میں ان حقائق کو بے نقاب نہ کر سکا۔ پیغمبروں کی زبان سے مسلسل خدا پرستی کی دعوت کے باوجود مظاہر قدرت انسان کو کچھ اس طرح متاثر کرتے رہے کہ خدا کے بجائے وہ انھیں مظاہر کو دیوتا بنا کر ان کو پوجتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے لئے کائنات پرستش کا موضوع بن گئی، حالانکہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ اس کے لئے تحقیق اور تسخیر (جاثیہ۔ ۱۳) کا موضوع بنتی۔

علم اسماء کے لاشعوری علم کو شعوری علم بنانے کے لئے تیسرا دھکا درکار تھا اور اس کو اسلامی انقلاب نے فراہم کر دیا۔ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب نے عالمی سطح پر مظاہر پرستی کو ختم کر کے خدا پرستی کی عمومی فضا پیدا کی۔ یہ فکری حرکت اتنی

طاقت ور تھی کہ جن مشرک قوموں نے اسلام کو اختیار نہیں کیا انھیں بھی اپنی زندگی اس میں نظر آئی کہ غیر اللہ کی پرستش کو چھوڑ کر خدا کی پرستش اختیار کرنے کی آواز بلند کریں۔ عیسائیوں میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ – ۱۵۴۶) اور ہندوؤں میں راما نند اس کی مثال ہیں۔ اس طرح معلوم انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ کائنات، پرستش کے بجائے تحقیق وتجسس کا موضوع بن گئی۔ یونانی قیاسات اور مصری توہمات کی بنیاد پر بنا ہوا فکری نظام ٹوٹ گیا۔ انسان نے خالی الذہن ہوکر عالم فطرت کے اسرار دریافت کرنے شروع کر دیئے یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب کہ الہامی علم اور انسانی علم دونوں ایک دوسرے کے مصدق بن گئے۔ یہ کھوج اولاً گیارھویں صدی عیسوی میں اسپین اور سسلی میں ابھری اور بیسویں صدی میں پہنچ کر مغرب نے اس کو ایک مکمل علم بنا دیا۔ پیغمبر اسلام کے ذریعہ ظہور میں آنے والا واقعہ (اسلامی انقلاب) آپ اور آپ کے اصحاب کی زندگی ہی میں مطلوب تھا اس لئے قرآن میں اس کے لئے حال کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ) مگر اگلا واقعہ (علوم فطرت کا انکشاف) آپ کے انقلاب کے زیر اثر بعد کو ظہور میں آنے والا تھا، اس لئے اس کو استقبال کے صیغہ میں بیان کیا گیا:

سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا (نمل – ۹۳)

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (فصلت – ۵۳)

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (یونس – ۳۹)

جدید سائنس کے ذریعہ فطرت کے جن اسرار وحقائق کا انکشاف ہوا ہے، ان کی اہمیت کو مذہبی حلقوں میں ابھی بہت کم سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ آلاء اللہ (اعراف – ۶۹) کا علم ہے۔ یہ علوم الٰہیہ کی تاویل (یونس – ۳۹) ہے۔ قرآن اگر آیات الٰہی کی تفصیل ہے تو سائنس کے دریافت کردہ حقائق تدبیر امر (رعد – ۲) کی تفسیر۔ اس "تیسرے دھماکہ" کے بعد حقیقت آخری طور پر برہنہ ہو چکی ہے۔ معرفت الٰہی کے تمام دروازے کھولے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ سچائی کو پانے میں ناکام رہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ عاجلہ پسندی (قیامہ – ۲۰) اور ظلم و علو (نمل – ۱۴) نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے۔ ایسے لوگوں کو اب صرف چوتھے دھماکہ کا انتظار کرنا چاہئے جبکہ صور (نبا – ۱۸) پھونکا جائے گا۔ اور موجودہ دنیا کی بساط لپیٹ (انبیاء – ۱۰۴) دی جائے گی تاکہ سچوں کو ان کی سچائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔

اقدام سے پہلے تیاری ضروری ہے

عربی کا ایک مثل ہے: قبل الرّمی یُراش السهم (تیر مارنے سے پہلے تیر کو کمان میں ٹھیک طریقے سے جمایا جاتا ہے)۔ تیر کو کمان میں اچھی طرح بٹھائے بغیر یونہی چلا دیا جائے تو وہ کبھی نشانہ پر نہیں لگے گا۔ اسی طرح کوئی اقدام ضروری تیاری کے بغیر کیا جائے تو اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

لفظی تسکین کی قیمت بہت مہنگی دینی پڑی

جنگ عظیم ثانی میں آخری شکست سے کچھ ماہ پہلے جاپانی لیڈر یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ اتحادی طاقتوں کی طرف سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پوٹ ڈم ڈکلریشن جاری کیا گیا تو وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جاپانی پارلیمنٹ کی خواہش تھی کہ اس ڈکلریشن کی بنیاد پر اتحادی طاقتوں سے امن کی گفتگو شروع کی جائے۔

باضابطہ فیصلہ سے پہلے ۲۸ جولائی کو جاپانی وزیر اعظم سوزکی (SUZUKI) نے ایک پریس کانفرنس کی۔ انھوں نے پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جاپانی کابینہ موکوستسو (MOKUSATSU) کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ موکوستسو ایک جاپانی لفظ ہے جس کا کوئی قطعی متبادل انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود جاپانی میں بھی وہ ایک غیر واضح لفظ ہے۔ اس کا ایک مفہوم "تبصرہ سے رکنا" ہے۔ اور اغلباً جاپانی وزیر اعظم کی مراد یہی تھی۔ مگر خود جاپانی زبان ہی میں اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے، اور وہ ہے نظر انداز کرنا۔

جاپانی وزیر اعظم کو کابینہ کی طرف سے جس بیان کی ہدایت کی گئی تھی، وہ یہ تھا کہ جاپانی کابینہ پوٹ ڈم ڈکلریشن کے معاملہ میں ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچی ہے۔ مگر انھوں نے پریس کانفرنس میں جو لفظ استعمال کیا وہ سننے والے اخبار نویسوں کے لئے مبہم ثابت ہوا۔ جاپان کی ڈومی نیوز ایجنسی نے وزیر اعظم کے بیان کا جو انگریزی ترجمہ نشر کیا اس میں موکوستسو کا ترجمہ IGNORE کے لفظ سے کیا گیا۔ ایک لفظ کے دو ممکن مفہوم میں سے سخت تر مفہوم کے انتخاب کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ۴۵-۱۹۴۴ کے جاپان میں جنگی جنون کا جو ماحول تھا، اس میں "نظر اندازی" کا تصور عوامی ذوق کے زیادہ مطابق تھا۔ جاپان کے قومی حوصلوں کے لئے اس میں زیادہ تسکین مل رہی تھی۔ مگر اس لفظی تسکین کی قیمت جاپان کو بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔ اتحادی طاقتوں کے دفاتر میں جب یہ نشریہ سنا گیا تو انھوں نے سمجھا کہ جاپانیوں نے پوٹ ڈم ڈکلریشن کو نظر انداز کر دیا ہے ——— چند دن بعد ہی جاپان پر دو ایٹم بم گرائے گئے اور ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ ہو گیا۔ دو لاکھ انسان فوراً مر گئے اور بے شمار لوگ خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔

یہ انکشاف کاسو کوائی (KASUO KAWAI) نے کیا ہے جو اس سے پہلے جاپان کے طاقتور اخبار نپن ٹائمس (NIPPON TIMES) کے ایڈیٹر تھے۔

پلین ٹروتھ، دسمبر ۱۹۷۰

اسلامی حکومتیں

دور نبوت	(۶۲۲ — ۶۳۲)
خلافت راشدہ	(۶۳۲ — ۶۶۱)
بنو امیہ	(۶۶۱ — ۷۵۰)
بنو عباس	(۷۵۰ — ۱۵۱۶)
عثمانی خلافت ترکی	(۱۵۱۷ — ۱۹۲۲)
مغل سلطنت	(۱۵۲۶ — ۱۸۵۷)

لفظی تسکین کی قیمت

بہت مہنگی دینی پڑی

جنگ عظیم ثانی میں آخری شکست سے کچھ ماہ پہلے جاپانی لیڈر یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ اتحادی طاقتوں کی طرف سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پوٹسڈم ڈیکلریشن جاری کیا گیا تو وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جاپانی پارلیمنٹ کی خواہش تھی کہ اس ڈکلریشن کی بنیاد پر اتحادی طاقتوں سے امن کی گفتگو شروع کی جائے۔

باضابطہ فیصلہ سے پہلے ۲۸ جولائی کو جاپانی وزیر اعظم سوزوکی (SUZUKI) نے ایک پریس کانفرنس کی۔ انھوں نے پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جاپانی کابینہ موکوستسو (MOKUSATSU) کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ موکوستسو ایک جاپانی لفظ ہے جس کا کوئی قطعی متبادل انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود جاپانی میں بھی وہ ایک غیر واضح لفظ ہے۔ اس کا ایک مفہوم "تبصرہ سے رکنا" ہے۔ اور اغلباً جاپانی وزیر اعظم کی مراد یہی تھی۔ مگر خود جاپانی زبان ہی میں اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے، اور وہ ہے نظر انداز کرنا۔

جاپانی وزیر اعظم کو کابینہ کی طرف سے جس بیان کی ہدایت کی گئی تھی، وہ یہ تھا کہ جاپانی کابینہ پوٹسڈم ڈکلریشن کے معاملہ میں ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچی ہے۔ مگر انھوں نے پریس کانفرنس میں جو لفظ استعمال کیا وہ سننے والے اخبار نویسوں کے لئے مبہم ثابت ہوا۔ جاپان کی ڈومی نیوز ایجنسی نے وزیر اعظم کے بیان کا جو انگریزی ترجمہ نشر کیا اس میں موکوستسو کا ترجمہ IGNORE کے لفظ سے کیا گیا۔ ایک لفظ کے دو ممکن مفہوم میں سے سخت تر مفہوم کے انتخاب کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ۴۵-۱۹۴۴ کے جاپان میں جنگی جنون کا جو ماحول تھا، اس میں "نظر اندازی" کا تصور عوامی ذوق کے زیادہ مطابق تھا۔ جاپان کے قومی حوصلوں کے لئے اس میں زیادہ تسکین مل رہی تھی۔ مگر اس لفظی تسکین کی قیمت جاپان کو بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔

اتحادی طاقتوں کے دفاتر میں جب یہ نشریہ سنا گیا تو انھوں نے سمجھا کہ جاپانیوں نے پوٹسڈم ڈکلریشن کو نظر انداز کر دیا ہے ——— چند دن بعد ہی جاپان پر دو ایٹم بم گرائے گئے اور ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ ہو گیا۔ دو لاکھ انسان فوراً مر گئے اور بے شمار لوگ خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔

یہ انکشاف کاسو کوائی (KASUO KAWAI) نے کیا ہے جو اس سے پہلے جاپان کے طاقتور اخبار نپن ٹائمس (NIPPON TIMES) کے ایڈیٹر تھے۔

پلین ٹروتھ، دسمبر ۱۹۷۰

اسلامی حکومتیں

دور نبوت	(۶۳۲ — ۶۲۲)
خلافت راشدہ	(۶۶۱ — ۶۳۲)
بنو امیہ	(۷۵۰ — ۶۶۱)
بنو عباس	(۱۵۱۶ — ۷۵۰)
عثمانی خلافت ترکی	(۱۹۲۲ — ۱۵۱۷)
مغل سلطنت	(۱۸۵۷ — ۱۵۳۶)

اسلام کا طریقہ حقیقت پسندی کا طریقہ ہے

نہ کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر چھلانگ لگانے کا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (حج - ۳۹)

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

مکہ کے مشرک مسلمانوں کو بہت تکلیفیں دیتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو کسی کا سر پھٹا ہوتا، کوئی زخمی ہوتا، کوئی چوٹ کھایا ہوا ہوتا۔ وہ آپؐ سے شکایتیں کرتے۔ مگر آپ کا جواب صرف یہ ہوتا: صبر کرو مجھے ابھی لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (اصبروا فانی لم اومر بالقتال، تفسیر النسفی)۔ اسی حال میں تیرہ برس گزر گئے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں قتال کی ہدایات بھیجی گئیں۔ عبد الرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں عبد اللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ کچھ اوپر ستر آیات میں قتال کی ممانعت کے بعد اجازت کی یہ پہلی آیت قرآن میں نازل ہوئی (ھی اول آیۃ اُذن فیھا بالقتال بعد ما نھی عنہ فی نیف وسبعین آیۃ)

یہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں پر ظلم تو مکی دور میں اپنی بدترین شکل میں ہو رہا تھا، اور اللہ بلاشبہ اس وقت بھی مسلمانوں کی نصرت پر پوری طرح قادر تھا۔ پھر مکہ میں "قتال" کی اجازت کیوں نہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق مسلمان ابھی اتنے طاقتور نہ ہوئے تھے کہ ان کا کوئی اقدام فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچ سکتا۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کی طاقت اس معیار کو پہنچ گئی کہ ان کا اقدام یوم الفرقان (انفال - ۴۱) کو وجود میں لانے کے ہم معنی بن سکے تو مڈبھیڑ کی اجازت دے دی گئی۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس سے اسلام کے علم بردار جس طرح اپنے مفروضہ حریفوں سے ٹکرا رہے ہیں اور نقصان ہر بار اسلام کے علم برداروں کے حصہ میں آتا ہے، وہ اس قرآنی اصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقدامات محض نادانی کے اقدامات تھے، اگرچہ غلط طور پر ان کو "اسلامی جہاد" کا مقدس نام دے دیا گیا۔

یہ سیاست!

پاکستان کی قومی اسمبلی کے انتخاب (۷، مارچ ۷۷) کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو پاکستان کی نو پارٹیوں کے اسلامی محاذ نے شور مچانا شروع کیا کہ مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی دھاندلی کر کے الکشن جیتی ہے۔ یہ بات جزوی طور پر ہی صحیح تھی۔ مسٹر بھٹو نے صرف ۲۰ سیٹوں پر دھاندلی کی تھی۔ اس دھاندلی کا مقصد اپنی کامیابی کی مقدار کو بڑھانا تھا۔ ورنہ ان کو پاکستان میں اتنی مقبولیت حاصل تھی اور اب بھی حاصل ہے کہ قطعاً منصفانہ الکشن میں بھی ان کی پارٹی ۵۰ فی صد سے زیادہ نشستوں پر قابض ہو سکتی تھی۔

تاہم اسلامی عدل کے علم برداروں کے لئے یہ جزوی غلطی بھی ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے ملک میں آگ لگا دی۔ گارجین اور اکونومسٹ (لندن) کے ایشیائی نمائندہ سائمن ونچسٹر SIMON WINCHESTER نے پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ انتخابات کے نتائج کے اعلان کے چند گھنٹہ بعد ہی پاکستان قومی اتحاد نے پاکستان کے شہروں میں بلوے اور احتجاج کی مہم شروع کر دی۔ اس کے بعد حکومت کی مشنری قیام امن کے لئے متحرک ہوئی۔ اور پھر جو نتیجہ نکلا، وہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

A FEW HOURS LATER THE JEEPS WERE OUT IN LAHORE, RAWALPINDI, **HYDERABAD**, AND KARACHI. THERE WERE CURFEWS, GASSINGS, SHOOTINGS MORE RIOTS, MANY DEATHS. BY THE TIME THE UNREST SETTLED, SOME THREE HUNDRED PAKISTANIES HAD DIED-----AND ALL, IT NOW SEEMS FOR NOTHING. (I.W., 16-10.77)

چند گھنٹے بعد لاہور، راولپنڈی، حیدرآباد اور کراچی کی سڑکوں پر جیپیں دوڑ رہی تھیں۔ کرفیو، آنسو گیس، گولیاں اور پھر مزید فسادات اور اموات۔ اب جبکہ یہ ہنگامہ تھم گیا ہے، تقریباً تین سو پاکستانی ہلاک ہو چکے ہیں، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک بے مقصد انجام کے لئے۔"

بدقسمتی سے یہی ہماری پوری جدید تاریخ کا خلاصہ ہے — سیاسی اقدامات، بربادیاں اور پھر آخر میں کچھ نہیں۔ ڈیڑھ سو برس سے پوری قوم نہایت اخلاص کے ساتھ اسی نام نہاد قربانی کے عمل کو دہرا رہی ہے۔

وہ انسانی گروہ جس کے مجموعہ کو "ہندستانی مسلمان" کہا جاتا ہے، چالیس سال پہلے ایک عظیم ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا جس کی سرحدیں ایک طرف برما سے لے کر بلوچستان تک اور دوسری طرف سیلون سے لے کر تبت تک چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے — اپنے بل پر نہیں بلکہ انگریزوں کے بل پر — ایک طوفانی تحریک اٹھائی۔ اس تحریک کا مقصد ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء میں جب یہ کوشش اپنے انجام کو پہنچی تو برصغیر کے مسلمان آٹھ علیحدہ ملکوں (پاکستان، ہندستان، سیلون، برما، تبت، نیپال، بھوٹان، مالدیپ) میں بٹ گئے۔ اس سے پہلے وہ اس پورے خطہ میں بے روک ٹوک سفر کر سکتے تھے اور ہر جگہ اللہ کے پیغام کی اشاعت کے لئے جدوجہد کر سکتے تھے۔ مگر دوسروں کے بل پر کی ہوئی کوشش کا نتیجہ ان کے اپنے حق میں نہیں نکل سکتا تھا۔ انگریز نے مسلمانوں کو آٹھ ملکوں میں تقسیم کر کے ان کی قوت منتشر کر دی۔

اس کے بعد دوسری چھلانگ شروع ہوئی۔ اس چھلانگ کا عنوان تھا: "مملکت خداداد میں اسلامی قانون کا نفاذ"۔ مگر اس بار بھی اقدام کرنے والوں کے ساتھ وہی کمزوری لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی طاقت کے بل پر اپنے مفروضہ حریف کو زیر نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اولاً موجودہ پاکستان

ے سبکدوش ہونا پڑا۔ اس دینی خدمت کے لئے اپنے ساتھ [illegible]
اس سے بھی اپنی قوت کی کمی کی تلافی نہ ہو سکی تو جمہوریت کے نام
پر ہنگامہ کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کرایا گیا۔ ان کی رہائی
اسلام کے تو کچھ کام نہ آئی۔ البتہ اس کے فوراً بعد بنگالیت اپنے
تمام اجزار کے ساتھ زندہ ہو گئی۔ دوسروں کے بل پر کئے ہوئے
اس اقدام کا نتیجہ ۱۹۷۱ میں اس طرح برآمد ہوا کہ پاکستان
مزید دو ٹکڑے ہو گیا۔ متحدہ پاکستان نے پاکستان اور بنگلہ
دیش کی صورت اختیار کر لی، مسلمانوں کی جغرافیائی تقسیم کا
عدد آٹھ سے نو تک پہنچ گیا۔

بچے ہوئے پاکستان میں اب اسلام پسند گروہ پھر
اپنے مقدس مشن کے لئے متحرک ہے۔ تاہم وہ محسوس کر رہا
ہے کہ اس کی اپنی طاقت اس کے محبوب انقلاب کو لانے کے
لئے ناکافی ہے۔ اپنی اس کمی کی تلافی کے لئے اب وہ خان
عبد الولی خاں کو رہا کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تادم تحریر
یہ کوشش ابھی واقعہ نہیں بنی ہے۔ تاہم بادشاہ خان کا یہ
حوصلہ مند وارث اگر قید سے باہر آگیا تو یقینی ہے کہ پختونستان
کی تحریک از سر نو زندہ ہو جائے گی اور عجب نہیں کہ اسلامی
خلافت کے قیام کی یہ بلند بانگ تحریک صرف اس انجام پر ختم
ہو کہ موجودہ پاکستان دوبارہ منقسم ہو کر شرقی اور غربی حصوں
میں بٹ جائے اور برصغیر کے مسلمانوں کا جغرافیائی انتشار
دس کے عدد کو پورا کر لے۔ تلک عشرۃ کاملۃ !

وحیدالدین ــ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷

یہ کام ہے یا لیڈری

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۷۴ ــ ۱۹۱۳) ابتدا میں آل انڈیا امن کونسل کے ممبر تھے۔ اس کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے اور اولاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور اس کے بعد مسلم مجلس کے ذریعہ کام کرتے رہے۔ امن کونسل سے اپنی علیحدگی کے بارے میں ایک شخص کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

" جب جبل پور میں بدامنی (۱۹۶۳) ہوئی تو میں نے کونسل سے کہا کہ چلو جبل پور چل کر کچھ کام کریں۔ مگر ان لوگوں نے میری بات نہ مانی۔ وہ بین الاقوامی امن کی بات تو کرتے تھے۔ مگر انھیں گھر کی بدامنی رفع کرنے کے کام سے دل چسپی نہ تھی۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی اور محسوس ہوا کہ ایسی تنظیم سے میرا تعلق رکھنا بے کار سی بات ہے۔ اس لئے میں نے استعفا دے دیا" (الحسنات اگست ۷۷ ۱۹)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو بات امن کونسل کے بارے میں کہی، وہ صد فی صد صحیح ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ خود ہمارے رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا تقریباً ہر رہنما، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عالمی کاموں سے خصوصی دل چسپی رکھتا ہے۔ اپنے گھر، اپنے محلہ، اپنے ادارہ اور اپنے قریبی دائرہ میں اس کے لئے جو کام ہیں، اس میں مصروف ہونا وہ اپنے لئے چھوٹی بات سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس آل انڈیا اجتماعات کی صدارت اور بین اقوامی نمائش گاہوں میں تقریری کمال دکھانا اس کو زیادہ پسند ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کی بربادی کی، اگر کُل نہیں تو کم از کم ایک بڑی وجہ، یقیناً یہی ہے۔

ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو

سابق وزیر اعظم ملیشیا تنکو عبد الرحمٰن نے بتایا کہ ملیشیا میں جو غیر مسلم آباد ہیں، وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے بہت شائق ہیں، مگر مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ان کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ الیکشن کے موقع پر غلط قسم کی سیاست بازی کے ذریعہ وہ غیر مسلموں کو اسلام سے کچھ متوحش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی جماعت "پرکم" کی کوششوں سے ملیشیا میں تقریباً ۳۰ ہزار اور صباح میں ایک لاکھ آدمی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ سراوک میں ہر دن لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر مسلمان ان کو اپنے معاشرہ میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ ان نومسلموں سے مصافحہ تک نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق "ان کے ہاتھ سور کی چربی سے گندے
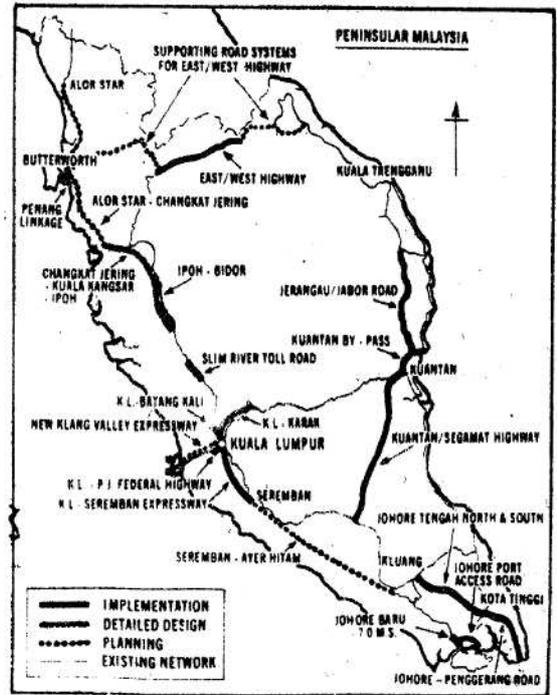
ملیشیا کی حکومت نے جزیرہ نما میں نئی سڑکوں کی تعمیر کے لئے ایک بلین ڈالر کا منصوبہ بنایا ہے۔

ہو چکے ہیں۔"

تنکو عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:

TODAY I AM FIGHTING A LONE BATTLE TO GET THESE MUSLIM CONVERTS ACCEPTED INTO THE MALAY COMMUNITY.

ان نومسلموں کو ملایا کے مسلم معاشرہ میں شامل کرنے کے لئے میں ایک تنہا جنگ لڑ رہا ہوں

اسلامک ہیرالڈ، کوالالمپور، دسمبر ۱۹۷۵

تنکو عبد الرحمٰن اپنی سیاسی زندگی کے زمانہ میں ملیشیا کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ مگر جب انھوں نے سیاست کی ہنگامی زندگی کو چھوڑ کر تعمیری کام کرنا چاہا تو اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ کسی قائد کا ساتھ صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ وہ ان کو جذباتی سیاست کی شراب پلا رہا ہو۔ خاموش کام کرنے والوں کا ساتھ دینے کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ اس مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ ہمارے درمیان کچھ قائد ایسے نکلیں جو عزت و شہرت کی قربانی پر اپنے آپ کو خاموش تعمیری کاموں میں لگا دیں۔ جب قائدین کی ایک نسل اس طرح اپنے آپ کو گم نامی کے قبرستان میں دفن کر چکی ہوگی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملت کو حقیقی معنوں میں دنیا کے اندر عزت و سربلندی کا مقام حاصل ہو۔ اگر ہمارے قائدین شہرت و عزت کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوں اور عوام کو تعمیری کام کا وعظ سنائیں، تو یہ کام کبھی انجام نہیں پا سکتا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ تنکو عبد الرحمٰن جیسے تعمیری کام کا ذوق رکھنے والے ہمارے یہاں صرف استثناء کا درجہ رکھتے ہیں۔

اختلاف سے بچو

"اے مسلمانو! خدا سے ڈرو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ اور اس میں متفرق نہ ہو۔ آپس میں اختلاف کرنا آگ کے کنارے کھڑا ہونا ہے۔ خدا کے نزدیک وہی لوگ کامیاب ہیں جو خصوصی اہتمام کے ذریعہ ہر حال میں اپنے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا کو باقی رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے خداوندی علم کی امانت یہود کو دی گئی تھی۔ مگر وہ تفریق اور اختلاف میں پڑ گئے اور اس کے نتیجہ میں اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق بنا لیا۔ ان کے انجام سے ڈرو اور تم بھی انھیں کی طرح نہ ہو جاؤ۔"

(آل عمران ۱۰۲-۱۰۶)

یہ تفریق و اختلاف جس سے بچنے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے، اس کے بے شمار نقصانات ہیں۔ ان میں سے ایک وہ نقصان ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر ۸ میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

"اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں نزاع مت کرو۔ ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"

انفال ۔۔۔ ۴۶

اتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ انسانوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر جو لوگ خدا سے ڈرتے ہوں وہ، معاملہ کی وضاحت کے بعد، یا تو اپنے اختلافات کو ختم کر دیتے ہیں اور اگر پھر بھی اختلاف باقی ہو تو وہ اس کو اپنے ذہن تک محدود رکھتے ہیں۔ عملی زندگی میں اس کو پھیلا کر معاشرہ کو خراب نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں وہ اس کو اپنے عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی دلائل دیئے جائیں، وہ اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ ایسا نہیں کرتے کہ اختلاف رائے کو عناد کی حد تک جانے سے روکیں اور اس کو باہمی کدورت کا سبب بننے نہ دیں۔ یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جو قوم کو کمزور

ایک غیر متحد قوم، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو اپنے حریف کے لئے خطرہ نہیں بن سکتی

موشے دیان (پیدائش ۱۹۱۵) نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے جس کا نام ہے میری زندگی کی کہانی (THE STORY OF MY LIFE)

اسرائیل کے سابق وزیر دفاع نے اپنے حالات کے ذیل میں عربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

THE ARABS, DISUNITED AND AT ODDS WITH ONE ANOTHER OVER EVERY ISSUE, BIG AND SMALL, PRESENT NO THREAT

غیر متحد عرب جو ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر باہم لڑتے رہتے ہیں، اسرائیل کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے

کرتا ہے اور اس کو خدا کی نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔

اصحاب رسول جو سب کے سب پاکباز لوگ تھے، ان کے درمیان بھی اختلافات پیدا ہوتے تھے۔ مگر وہ کبھی اختلافات کو عناد بننے نہیں دیتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اختلاف کے ساتھ اتحاد کے تقاضوں کو کس طرح پورا کرنا چاہئے۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان ہجرت سے سترہ سال پہلے پیدا ہوئے اور سنہ ۶۰ھ میں وفات پائی۔ وہ حضرت علی بن ابی طالب سے چھ سال چھوٹے تھے۔ حضرت علی جو چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے تو امیر معاویہ شام کے حاکم تھے۔ اس کے بعد دونوں میں اختلاف ہوا جو حسن بن علی تک جاری رہا۔ بالآخر فیصلہ امیر معاویہ کے حق میں ہوا۔ ربیع الاول ۴۱ھ سے لے کر آخر عمر تک (۲۰ سال) وہ تقریباً تمام اسلامی دنیا کے خلیفہ رہے۔

جس زمانہ میں علی و معاویہ کے درمیان اختلافات بڑھے ہوئے تھے، قسطنطنیہ (استنبول) کی عیسائی حکومت نے سمجھا کہ مسلم سلطنت پر حملہ کرنے کا یہ موزوں ترین وقت ہے۔ اس نے عیسائیوں کی ایک بڑی فوج تیار کی اور ایران کے شمالی صوبوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ علاقہ اس وقت حضرت علی کی حکومت میں شامل تھا۔ اگر یہ حملہ ہو جاتا تو اس وقت حضرت علی کے لئے اس کو بچانا مشکل ہو جاتا۔ بظاہر دکھائی دیتا تھا کہ یہ پورا حصہ کٹ کر عیسائی سلطنت میں شامل ہو جائے گا۔

عیسائی حکمراں حضرت علی کی مشکلات سے خوب واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ علی، امیر معاویہ کے لئے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ علی کو کمزور کرنے کی عیسائی کوشش سے خوش ہوں گے اور مزاحمت نہیں کریں گے۔ اس طرح علی کو زیر کرنا ان کے لئے آسان ہو جائے گا۔ مگر امیر معاویہ، علی بن ابی طالب سے اختلاف کے باوجود ان کے معاند نہیں بن گئے تھے۔ وہ اس بات کے لئے تیار نہ تھے کہ ان دونوں کا باہمی اختلاف اسلامی دنیا کے لئے کسی نقصان کا سبب بن جائے۔ انھوں نے اس خبر کے سنتے ہی قیصر (قسطنطنیہ کے بادشاہ) کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"اے رومی کتے! اگر تو ہمارے باہمی اختلاف
سے فائدہ اٹھا کر ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے
تو تجھ کو معلوم ہونا چاہئے کہ علی کی قیادت
میں جو لشکر تیرے مقابلہ کے لئے نکلے گا،
معاویہ اس لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوگا"

یہ خط عیسائی حکمراں کے لئے ایک فوج سے بھی زیادہ شدید ثابت ہوا۔ اس نے اسلامی علاقہ پر حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔

■ ■ ■ ■ ■ ■ ■ ■ ■

قومی کردار

دوسری جنگ عظیم میں جب کہ برطانوی فوج کے سامنے یہ مہم تھی کہ وہ ڈنکرک میں پھنسے ہوئے پانچ لاکھ فوجیوں کو فوری طور پر نکالے۔ اس وقت کے برطانی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے قوم سے اپیل کی کہ جن لوگوں کے پاس کشتیاں اور اسٹیمر ہیں، وہ بطور خود ان کو فلاں مخصوص مقام پر پہنچا دیں۔ پوری قوم نے اس اعلان کی تعمیل اس طرح کی کہ کوئی ایک شخص بھی نہ بچا جس نے اپنی کشتی اور اسٹیمر مقررہ مقام پر نہ پہنچا دی ہو۔

"الاسلام"، کے بعد ادارۂ الرسالہ کی دوسری کتابی پیش کش

ظہور اسلام

عنقریب شائع ہونے والی ہے

مقابل صفحہ پر اس کا "ابتدائیہ" نقل کیا جارہا ہے

صفحات (تخمیناً) ۲۰۰
قیمت (تخمینی) چھ روپے

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے انسانی تاریخ میں دور نشر کا آغاز کیا۔ علمی طرز فکر کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک استدلال کو رائج کیا۔ موجودہ دور کا علمی انقلاب، قرآن ہی کے پیدا کردہ انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے حاملین اس انقلاب کو سمجھنے میں سب سے پیچھے ہیں —— وہ ابھی تک شعر و شاعری کی فضا سے نکل نہ سکے۔ حتیٰ کہ ان کی نثر بھی خطابت اور شاعری کی ایک صورت ہوتی ہے۔ سائنٹفک استدلال میں ان کے پیچھے ہونے کا حال یہ ہے کہ ان کے علماء اب بھی سائنٹفک استدلال اور مغرب زدگی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی پس ماندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دور جدید کے معیار فکر پر ابھی تک اسلام کا علمی اظہار نہ ہو سکا۔ ہر دور کا ایک اسلوب اور ایک علمی معیار ہوتا ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے دور کے فکری معیار پر خدا کے دین کا اعلان عام کریں۔ مگر مسلمان جب خود ہی فکری پس ماندگی میں مبتلا ہوں تو وہ اس ذمہ داری کو کس طرح ادا کر سکتے ہیں

آغاز کلام

ستمبر ۱۹۶۳ کی ۱۲ تاریخ تھی۔ راقم الحروف ندوہ (لکھنؤ) کی مسجد میں تھا اور ظہر کی سنتیں پڑھ کر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن میں یہ خیال گھوم رہا تھا کہ اسلام کے تعارف کے لئے آج ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو وقت کی زبان اور اسلوب میں لکھی گئی ہو اور جدید انسان کو مطالعہ کے لئے دی جا سکے۔" کاش اللہ تعالیٰ مجھے اس کتاب کے لکھنے کی توفیق دے" یہ تمنا بے ساختہ دعا کی شکل میں میری زبان سے نکلی اور اس کے بعد یکایک یہ انگریزی لفظ میری زبان پر تھا :

GOD ARISES

یہ گویا کتاب کا نام تھا جو اچانک میرے ذہن میں وارد ہوا۔ اس سے پہلے کبھی یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ کتاب کے نام کی حیثیت سے اس کی معنویت بھی اس وقت پوری طرح مجھ پر واضح نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد حسب معمول نریندر دیو لائبریری گیا جو ندوہ کے قریب دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ویبسٹر کی لغت میں لفظ ARISE کے استعمالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ بائبل کی ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ پورا فقرہ یہ ہے :

LET GOD ARISE, LET HIS ENEMIES BE SCATTERED,
LET THEM ALSO THAT HATE HIM FLEE BEFORE HIM.

AS SMOKE IS DRIVEN AWAY, SO DRIVE THEM AWAY;
AS WAX MELTETH BEFORE THE FIRE, SO LET THE
WICKED PERISH AT THE PRESENCE OF GOD.

Psalm 68: 1-2

خدا اٹھے۔ اس کے دشمن تتر بتر ہوں۔ وہ جو اس کا کینہ رکھتے ہیں، اس کے حضور سے بھاگیں۔ جس طرح دھواں پراگندہ ہوتا ہے، اسی طرح تو انھیں پراگندہ کر۔ جس طرح موم آگ پر پگھلتا ہے، شریر خدا کے حضور فنا ہوں۔

زبور کی یہ دعا حقیقۃً پیغمبر اسلام کی آمد کی پیشین گوئی ہے۔ یہ اسی منصوبۂ الٰہی کا ذکر ہے جو قرآن میں سورہ صف (۸ ـ ۹) اور سورہ فتح (۲۸) میں وارد ہوا ہے۔ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جس عظیم الشان سطح پر اپنے دین کا اظہار کرنے والا تھا، اسرائیلی پیغمبر (داؤدؑ) کی زبان سے یہ شکل دعا اس کو کہلایا گیا جو نبی آخر الزماں سے ڈیڑھ ہزار برس قبل پیدا ہوئے تھے۔

اس طرح گویا اذان اور اقامت کے درمیان مسجد کے اس تجربہ میں مجھ کو کتاب کا نام اور اس کا موضوع دونوں بتا دیا گیا۔

عمر کی چھٹی دہائی میں پہنچنے کے بعد میری بہترین تمنا یہ تھی کہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک کتاب تیار کر سکوں جو اردو میں "ظہور اسلام" اور انگریزی میں GOD ARISES کے نام سے شائع ہو۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اپنی تکمیلی شکل میں شاید کسی اور سے لیا جانے والا ہے، کیونکہ اس کی باقاعدہ تیاری کے لئے جو مواقع درکار ہیں، وہ موجودہ حالات میں مجھے حاصل نہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں چند مطالعہ اس امید میں پیش کیا جا رہا ہے کہ کسی آنے والے کے لئے شاید وہ نقش اول کا کام دے سکے۔

وحید الدین — ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۷

اعتراض برائے اعتراض

۱۔ یونیورسٹی کے ایک استاد کو ان کے ساتھی نے کتاب "الاسلام" پڑھنے کے لئے دی۔ انھوں نے کتاب کھولی تو اس کا پہلا جملہ سامنے آیا:

"انسانی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ـــــ دور سائنس سے پہلے اور دور سائنس کے بعد۔ وہ چیز جس کو دور جدید کہتے ہیں، وہ حقیقۃً دور سائنس کا دوسرا نام ہے۔ یہ دور ممتاز طور پر سترھویں صدی میں شروع ہوا اور دوسری عالمی جنگ تک اپنے آخری عروج پر پہنچ گیا" (صفحہ ۳)

ان سطروں کو دیکھ کر انھوں نے کتاب واپس کردی۔ انھوں نے کہا: "میں ایسی کتاب کو نہیں پڑھ سکتا جس کا پہلا جملہ ہی غلط ہو۔ سائنس سترھویں صدی میں شروع نہیں ہوئی، وہ اس سے بہت پہلے موجود تھی"۔

مذکورہ بزرگ اگر کتاب واپس کرنے میں جلدی نہ کرتے اور اس کے بقیہ صفحات کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتے تو ان کی غلط فہمی بآسانی دور ہوجاتی۔ کیوں کہ اسی کتاب میں آگے یہ سطریں موجود ہیں:

"سائنس کے ظہور کے ابتدائی عناصر اگرچہ تاریخ میں بہت پہلے سے کام کر رہے تھے۔ تاہم وہ نمایاں وقت جب کہ انسانی تاریخ ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہوئی، اس کا آغاز نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) سے ہوتا ہے"

(الاسلام صفحہ ۱۷۴)

آدمی دوسرے پر تنقید کرنے میں بہت کم انصاف سے کام لیتا ہے۔ اگرچہ ہر ناقد ہمیشہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کی تنقید عین انصاف کے مطابق ہے۔

۲۔ الاسلام کے پہلے باب میں رویت ہلال کے مسئلہ پر ایک ضمنی گفتگو ہے۔ اس سلسلے میں لکھا گیا ہے:

"حدیث میں ہے کہ اگر ۲۹ تاریخ کو افق پر بادل آجائیں اور چاند دیکھا نہ جاسکے تو ۳۰ تاریخ کو چاند کا دکھائی دینا ضروری نہیں۔ اس کے بعد بطور واقعہ رویت مان لی جائے گی ... ۲۹ تاریخ کو چونکہ رویت کا علم صرف آنکھ کے ذریعہ ہو سکتا تھا، اس لئے آپ نے دیکھنے کا حکم دیا۔ ۳۰ تاریخ کو معلوم فلکیاتی قانون پر قیاس کرنا کافی تھا، اس لئے آپ نے دیکھنے کی شرط حذف کردی"۔

الاسلام، صفحہ ۱۵

اس کے بارے میں ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ وہ غلط ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں

"غلط اس پہلو سے ہے کہ ۳۰ تاریخ کو رویت ہلال ضروری نہ ہونے کی وجہ فلکیاتی قانون پر قیاس نہیں ہے جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی قمری مہینہ ۳۰ دنوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اس لئے ۳۰ کو رویت ہلال کی ضرورت نہیں ہے۔ رویت ہلال کی بحث پیدا ہی اس لئے ہوتی ہے کہ بعض قمری مہینے ۲۹ کے بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ۲۹ کو بادل یا کسی اور وجہ سے رویت ہلال نہ ہو تو ۳۰ دن پورے کر لئے جائیں"۔

"معلوم فلکیاتی قانون پر قیاس" کے لفظ سے الاسلام کے مصنّف کی مراد ٹھیک وہی ہے جس کو تنقید نگار نے ان لفظوں میں لکھا ہے کہ "کوئی قمری مہینہ ۳۰ دنوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا"۔ مگر جب اعتراض برائے اعتراض کا ذہن ہو تو آدمی بھول جاتا ہے کہ کیا بات قابل تنقید ہے اور کیا بات قابل تنقید نہیں ہے۔

۳۳۔ الاسلام کے بارے میں ایک بے لاگ ناقد تحریر فرماتے ہیں "اس کتاب کی ایک نمایاں بات اس کی تضاد بیانی بھی ہے۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں"۔ اس سلسلے میں انھوں نے تضاد بیانی کی یہ مثال پیش فرمائی ہے کہ کتاب میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے بارے میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ مغل شہنشاہ جہانگیر سے مل کر انھوں نے جو اسلامی خدمات انجام دیں، اگر موجودہ زمانہ کے مصلحین نے بھی اسی ڈھنگ سے کام کیا ہوتا تو اب تک اظہار دین اور غلبۂ اسلام کا وہ کام انجام پا چکا ہوتا جس کے لئے ابھی ہم صرف غور و فکر کر رہے ہیں"۔ (صفحہ ۱۸) دوسری طرف انھیں مجدد الف ثانی کے بارے میں اس کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں:

"واسکوڈی گاما کے انتقال کے ۴۰ سال بعد شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۵ — ۱۵۶۴) پیدا ہوتے ہیں ان کا زمانہ ٹھیک وہی ہے جب کہ جنوبی ہند کے ساحل پر وہ واقعہ رونما ہو چکا ہے جو بالآخر اس ملک کی نئی تاریخ بنانے والا ہے مگر انھیں اس واقعہ کی خبر تک نہیں ہوتی۔ ایک طرف عالم بالا میں ان کی روحانی پرواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ وحدتِ وجود کی پیچیدہ بحث پر مجتہدانہ فیصلے دے سکیں مگر وہ خود اپنے ملک کے اس واقعہ سے بے خبر رہتے ہیں کہ مغربی قومیں بحری طاقت کو ترقی دے کر ملک کے سواحل پر قبضہ کر رہی ہیں جو بالآخر یہاں تک پہنچنے والا ہے کہ مدراس سے لے کر بمبئی اور کلکتہ تک کا پورا ساحلی ہندوستان ان کے قبضہ میں چلا جائے اور دہلی کی سلطنت ان کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جائے وہ اکبری فتنوں کو دیکھتے ہیں مگر تیز گامی فتنے انھیں نظر نہیں آتے جو بعد کو پیدا ہونے والے نتائج کے اعتبار سے بدرجہا شدید ہیں"۔ ص ۱۷۳

الاسلام کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد محترم ناقد لکھتے ہیں "پہلی تحریر سے حضرت مجدد کے بارے میں جو خیال قائم ہوتا ہے، اس دوسری تحریر سے اس کے برعکس خیال قائم ہوتا ہے"۔

فاضل ناقد کو ان دونوں عبارتوں میں "تضاد"، اس لئے نظر آیا کہ ان کی "بے لاگ تنقید نگاری" کا اصول غالباً یہ ہے کہ کسی شخص میں اگر ایک بات قابل تنقید نظر آئے تو اس کے یہاں کسی بھی قسم کی کسی خوبی کا اعتراف نہیں کیا جا سکتا۔

اصل یہ ہے کہ الاسلام کے صفحہ ۱۸ پر طریق کار کے مسئلہ کا ذکر ہے اور صفحہ ۱۷۳ پر جو گفتگو ہے، وہ ایک نظریاتی گفتگو ہے اور اس کا تعلق عصری تقاضوں کو سمجھنے سے ہے۔ مصنف کا کہنا یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب اپنے وقت کے اصل عصری مسئلہ (مغربی فتنہ) کو سمجھ نہ سکے۔ تاہم طریق کار کی بحث کے ذیل میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ان کے یہاں ایک قابل تقلید مثال پائی جاتی ہے۔ اپنے زمانہ کے ایک مقامی مسئلہ (اکبری فتنہ) کو فرو کرنے کے لئے انھوں نے جو طریق کار اختیار کیا، وہ، بحیثیت طریق کار کے، ایک حکیمانہ طریقہ تھا اور اس قابل تھا کہ وسیع تر مسئلہ (اسلام کے احیاء) کے سلسلے میں اس کو عملاً اختیار کیا جاتا۔

اختلاف کے وقت انصاف

ایک شخص بحث و گفتگو میں "مکمل اسلام" سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہو، مگر اختلاف کے وقت وہ انصاف سے ہٹ جائے (مائدہ — ۸) تو یہ عجیب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مکمل اسلام کی علم برداری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جزوی اسلام پر بھی قائم نہ ہو۔

آدمی کے سامنے سچائی آتی ہے
مگر ضد کی نفسیات اور عزت کا سوال
اس کو سچائی کے اعتراف سے روک دیتا ہے

"نئے عہدنامہ،، کے نام سے عیسائیوں کی جو مقدس کتاب ہے، اس میں حضرت مسیح کے حالات اور تعلیمات کے بارے میں چار انجیلیں شامل ہیں۔ تاہم چوتھی صدی عیسوی میں ان چار انجیلوں کو سرکاری طور پر معتبر قرار دینے سے پہلے اور بہت سی انجیلیں عیسائی حضرات کے درمیان رائج تھیں۔ انھیں میں سے ایک انجیل برناباس ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ برناباس حضرت مسیح کے حواریوں میں سے تھا۔ سینٹ پال نے جب مسیحیت کو بدلا تاکہ دوسری اقوام کے لئے مسیحیت میں داخلہ کو آسان بنایا جاسکے تو برناباس نے مسیح کے حالات اور تعلیمات کو اصلی شکل میں پیش کرنے کے لئے اپنی انجیل مرتب کی۔ تاکہ وہ "اس سچائی کو بیان کرے جو اس نے سنا اور دیکھا تھا،، کتاب کے آغاز میں برناباس لکھتا ہے:

"بہت سے لوگوں کو شیطان نے دھوکا دیا ہے۔ وہ مقدس بن کر بے دین عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ ختنہ کے طریقہ کو متروک قرار دیتے ہیں جس کو خدا نے ہمیشہ کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور حرام کھانوں کو حلال کر رہے ہیں۔ انھیں دھوکا کھانے والوں میں سے ایک پولوس بھی ہے۔"

موجودہ سرکاری انجیلوں اور برناباس کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برناباس، حضرت مسیح کی تعلیمات کا زیادہ صحیح اور معتبر ریکارڈ ہے۔ اس کی تعلیمات قرآن کی تعلیمات سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ مگر چونکہ وہ عیسائی حضرات کے موجودہ عقائد کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ لوگ اس کو جعلی انجیل PSEUDO GOSPEL کہتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے ہدایت کا کوئی سامان نہیں

ایک بزرگ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہدنامہ کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

سچائی کو بتانے کے لئے خدا خود زمین پر نہیں اترتا، نہ فرشتوں کے ذریعہ اس کا اعلان کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ "کعبہ،، اور "بیت المقدس،، کے متولیوں کی زبان سے بھی اس کا پیغام بلند نہیں کرایا جاتا۔ سچائی کی دعوت ہمیشہ کسی غیر اہم گوشہ سے اٹھائی جاتی ہے تاکہ سنت اللہ کے مطابق اس میں التباس کا پہلو باقی رہے (انعام۔ ۹)
جو شخص التباس و اشتباہ کے ظاہری پہلوؤں سے گزر کر سچائی کو پالے، اس کے لئے یہ دعوت، زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جن کی نگاہیں التباس کے پردہ میں اٹک کر رہ جائیں، ان کے لئے اس دعوت میں محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

مسلم

"اس میں خدائی تعلیمات زیادہ صحیح اور مؤثر طریقہ سے بیان ہوئی ہیں"

یہ ان چاروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور مؤثر طریقہ سے بیان ہوئی ہیں۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ برناباس کے انگریزی ترجمہ (۱۹۰۷) کی ایک فوٹو سٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔"

اوپر کے اقتباس میں جس کمزوری کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ صرف عیسائیوں کی کمزوری نہیں ہے۔ بلکہ عام کمزوری ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ کچھ افکار وخیالات کو اپناتے ہیں۔ ابتداءً یہ اپنانا محض نظریاتی وابستگی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے وہ تعصب بن جاتا ہے اور اگر اس نظریہ کی بنیاد پر ان کو کچھ دنیوی مقبولیت حاصل ہو جائے تو تعصب مزید آگے بڑھ کر عزت کا سوال بن جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی سچائی خواہ کتنے ہی واضح انداز میں ان کے سامنے لائی جائے اور ان کے موقف کو کتنے ہی زیادہ دلائل سے غلط ثابت کر دیا جائے، بہرحال وہ اس سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ کسی حال میں اپنے سے باہر کسی سچائی کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح ان کا کاروبار بگڑ جائے گا۔ ان کی پوزیشن خطرہ میں پڑ جائے گی، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بالاثم کا مصداق بن کر وہ کھلی ہوئی سچائی کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

انجیل برناباس عیسائیوں کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر ضد اور تعصب نے ان کو اس نعمت سے محروم کر رکھا ہے۔ اس قسم کی نعمتوں کے دستر خوان اللہ دوسروں کے لئے بھی کھولتا ہے۔ مگر وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔ دوسروں کے ضد اور تعصب کی خبر ہر ایک کو ہے۔ مگر اپنے ضد اور تعصب کی کسی کو خبر نہیں۔

مسائل زمزم!

حدیث میں ہے:

ماء زمزم لما شرب له

زمزم کا پانی جس مقصد کے لئے پیا جائے وہ پورا ہوگا

دوسری حدیث ہے:

لا یجمع ماء زمزم ونار جهنم في جوف عبد

زمزم کا پانی اور دوزخ کی آگ ایک انسان کے پیٹ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

اس بنیاد پر فقہاء نے زمزم کے آداب مقرر کئے ہیں۔ فتاوی عالمگیری میں ہے کہ زمزم کا پانی خود اپنے ہاتھ سے نکالا جائے اور قبلہ کی جانب رخ کر کے خوب سیر ہو کر پیا جائے اور ہر سانس پر نظر اٹھا کر بیت اللہ کو دیکھے اور بچا ہوا پانی اپنے منھ اور جسم پر مل لیا جائے اور ہو سکے تو کچھ اپنے جسم پر بھی ڈال لے۔

ایک تاریخ

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر جب ان کا خاندان مصر گیا تو افراد خاندان کی کل تعداد ۶۷ تھی۔ (اس تعداد میں وہ لڑکیاں شمار نہیں کی گئی تھیں جو حضرت یعقوب کے گھرانے میں بیاہی ہوئی آئی تھیں) حضرت یوسف کی وفات کے تقریباً پانچ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق خروج کے بعد دوسرے سال بیابان سینا میں حضرت موسیٰ نے جو مردم شماری کرائی تھی، اس کے مطابق صرف قابل جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب ملاکر وہ کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ۶۷ افراد کے ایک خاندان کی تعداد پانچ سو سال میں محض توالد و تناسل سے اتنی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ تعداد میں اس غیر معمولی اضافہ کا سبب یقیناً بنی اسرائیل کی تبلیغ تھی۔ ان کی تبلیغ کے زیر اثر جن مصریوں نے اپنا دین بدلا، غالباً ان کا تمدن بھی بنی اسرائیل کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ بائبل میں ان نومسلموں کے لئے "ملی جلی بھیڑ" جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کے یہ دینی بھائی بھی ان کے ساتھ تھے۔

عدم تشدد کا ہتھیار تشدد سے زیادہ سخت ثابت ہوا

ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ میں شروع ہوئی۔ ابتدائی ۵۰ سال تک یہ تحریک تشدد کے طریقہ پر چلتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اہنسا کی بنیاد پر آزادی کی تحریک چلائیں گے۔

انگریز حکمراں کے لئے گاندھی جی کا عدم تشدد کا ہتھیار پچھلے "مجاہدین آزادی" کے تشدد کے ہتھیا سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ تشدد کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا ان کے پاس کافی وجہ جواز تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عدم تشدد کے اصول پر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو ایک پرانے انگریز کلکٹر نے سکریٹریٹ کو تار دیا:

KINDLY WIRE INSTRUCTIONS HOW TO KILL A TIGER NON-VIOLENTLY

براہ مہربانی بذریعہ تار ہدایات بھیجئے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے ——

اکثر لوگ سیاست کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حریف سے لامتناہی لڑائی جاری رکھی جائے۔ مگر اصل سیاست یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ حریف کو اس طرح بے ہتھیار کر دیا ئے کہ وہ لڑنے کے قابل نہ ہے

مطالعہ ——

ہبن اینڈ ہر گاڈس (انگریزی)
دی ہیملن پبلشنگ گروپ لمیٹڈ، لندن
۱۹۷۴، صفحات ۴۴۰

یہ مذہب پر ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں مختلف مغربی علماء کے ۲۴ مقالات درج ہیں۔ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کے تمام مذاہب کی معلومات نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ کثیر تعداد میں قیمتی تاریخی تصاویر اور حسن ترتیب نے کتاب کو ایک خوبصورت البم بنا دیا ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہب پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ یا تو کسی مذہب کی موافقت میں ہوتی تھیں، یا اس کی مخالفت میں۔ مذاہب کا غیر جانب دارانہ تاریخی تعارف قدیم زمانہ میں ایک لامعلوم چیز تھی، موجودہ زمانہ میں جو چیزیں پیدا ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذاہب اور دوسرے موضوعات پر اس انداز سے کتاب لکھی جاتی ہے گویا کہ لکھنے والا اپنے موضوع پر کوئی موافق یا مخالف رائے نہیں رکھتا، وہ صرف ایک فلمی کیمرہ کا فرض انجام دے رہا ہے جس کی ساری دلچسپی اصل صورت حال کی تصویر کشی سے ہے نہ کہ اس کے بارے میں اپنی کوئی رائے دینے سے۔

زیر نظر کتاب بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے مرتب نے کتاب کا خاتمہ حسب ذیل سطروں پر کیا ہے:

"اس انسائیکلوپیڈیا نے حقائق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کام حکم لگانا یا کوئی معیار قائم کرنا نہیں، اس نے صرف سچائی کو پیش کر دیا ہے (صفحہ ۴۳۱)

قدیم طرز کی متکلمانہ کتابیں "پروپیگنڈا لٹریچر" سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اس طرز تصنیف نے آج کے متکلمین کو موقع دیا ہے کہ وہ بظاہر لوگوں کو علوم کی تدوین کرتے ہوئے نظر آئیں، حالانکہ حقیقۃً وہ اپنا کلامی لٹریچر تیار کر رہے ہوں اور پھر یہی کتابیں تعلیم گاہوں میں عمومی نصاب کے طور پر داخل ہوں۔ لائبریریوں کے ریفرنس سکشن میں سجائی ہوئی ہوں۔ علمی تحقیق کے لئے ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس طرز تصنیف کے رواج سے یہودیوں اور عیسائیوں نے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ انداز ترتیب کے لحاظ سے مکمل طور پر غیر جانب دار رہ کر مذہب اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کو آدمی اس طرح پڑھتا ہے گویا کہ وہ ایک موضوع کا علمی مطالعہ کر رہا ہے نہ کہ اس کے بارے میں کسی موافق یا مخالف کا تبصرہ پڑھ رہا ہے۔ اور پھر نہایت ہوشیاری سے وہ اس کے بین السطور میں اپنا نقطۂ نظر شامل کر دیتے ہیں۔

اس انسائیکلوپیڈیا میں جس کے ایک مقالہ نگار ہندو اور باقی سب یا یہودی یا عیسائی ہیں، اسلام کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بظاہر اس میں اسلام کی دعوتی، تہذیبی اور سیاسی کامیابیوں کا فیاضانہ اعتراف موجود ہے۔ حتیٰ کہ اس میں یہ جملہ بھی ہے:

ITS ADVENT CHANGED THE COURSE OF HUMAN HISTORY (P.389)

اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔ اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی اسلام نے پُرامن ذرائع سے نئی کامیابیاں (NEW GAINS) حاصل کی ہیں۔ افریقہ میں تیزی سے نومسلموں کا اضافہ کسی تبلیغی کوشش سے زیادہ اسلام کی اپنی کشش کی بنیاد پر ہو رہا ہے (۴۰۴) تاہم اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لکھنے والے نے یہ سطریں کیونکر لکھیں۔

مثال کے طور پر صفحہ ۳۹۵ پر درج ہے:

" محمد کو اپنی زندگی میں عرب سے باہر کسی علاقہ کا قبضہ حاصل نہیں ہوا کسی طرح یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سمجھتے ہوں کہ عربوں کے علاوہ بھی اسلام میں کسی کے لئے کوئی معنویت ہے، اگرچہ بعد کا مسلم نظریہ ان کے عالمی مقاصد کی توثیق کرتا ہے، تاہم اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں انھوں نے عرب کی بعض سرحدی عیسائی ریاستوں کے خلاف مہم بھیجی جو جزیرہ نما کے شمال میں واقع تھیں۔ ان مہموں نے مسلمانوں کو عظیم بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں سے ٹکرا دیا اور پیغمبر کی وفات کے جلد ہی بعد تیز رفتار اور دائمی فتح کا سبب بن گئیں۔"

اس پیراگراف نے اسلام کو اس سطح پر کھڑا کر دیا جہاں موجودہ مسیحیت ہے، بائبل کے مطابق حضرت مسیح اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجے گئے (متی ۱۵: ۲۴)۔ مگر بعد کو سینٹ پال اور دوسرے مسیحی راہبوں نے کشف ورویا کا سہارا لے کر مسیحیت کو عالمی بنا دیا۔ مگر پیغمبر اسلام کی بابت یہ بیان بالکل خلاف واقعہ ہے۔ قرآن میں صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ آپ تمام دنیا کے لئے ڈرانے والے (فرقان۔۱) بنا کر بھیجے گئے۔ آپ نے خود فرمایا کہ اُرسلتُ الی الناس کافتہ (میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں) آپ نے اپنی زندگی ہی میں عرب کے باہر دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ اور صریح طور پر پیش گوئی فرمائی کہ اسلام عنقریب ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ وغیرہ

اسی طرح اس کتاب میں وہ غلطی بھی کی گئی ہے جو موجودہ زمانہ کے رواجی مطالعہ کی بنا پر اکثر مذہبی مصنفین کرتے ہیں۔ اسلام کسی تاریخ کا نام نہیں، وہ قرآن، رسول کی سنت اور آپ کے اصحاب کے چھوڑے ہوئے نمونہ کا نام ہے۔ اس لئے اسلام کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات، رسول کی ثابت شدہ سنت اور صحابہ کرام کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر اسلام کو سمجھا جائے۔ اسلام صرف اسی چیز کا نام ہو جو ان معیاری ذرائع سے معلوم ہو، اس کے سوا کسی چیز کا نام اسلام نہ ہو۔ بعد کے دور میں اسلام کی جو تاریخ بنی، اس کو مذکورہ بالا معیار پر جانچا جائے اور اتنے ہی حصہ کو اسلام قرار دیا جائے جو اس معیار پر پورا اترے۔ باقی کو "انحراف" قرار دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ سے الگ کر دیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصنفین اس کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ اسلام کے نام پر مسلمانوں میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، اس کو اکٹھا کرتے ہیں اور اس پورے مجموعہ کو اسلام قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرح توحید سے لے کر بزرگ پرستی تک ہر چیز کا نام اسلام ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کبھی کسی "مسلمان" نے گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہو کر ایک تصویر بنائی جس میں دکھایا کہ فرشتہ ایک پردار خاتون کی شکل میں آیا ہے اور پیغمبر اسلام کو خدا کی وحی پہنچا رہا ہے۔ اس تصویر کو نہایت اہتمام سے اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا اور کتاب میں اس کا فوٹو (صفحہ ۳۹۱) چھاپ دیا گیا۔ اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں کسی مسلمان یا عیسائی نے دو صاحب ریش بزرگوں کی تصویر بنائی اور ان کے سر پر پگڑی رکھی۔ ایک کو اونٹ پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا، دوسرے کو گدھے پر۔ گدھے کے مسافر کے نیچے لکھ دیا "عیسٰی"، اونٹ کے مسافر کے لئے لکھ دیا: "محمد"، یہ تصویر بھی اسلامی تاریخ کے ایک قیمتی صفحہ کی حیثیت سے کتاب (۴۳۱) کی زینت بن گئی۔ مسلمانوں میں ایک گروہ پیدا ہوا جس نے دوسری قوموں کے اثر سے "وجد"، کا نظریہ

نکالا۔ ایسے لوگوں کی ایک مجلس کا فوٹو لے لیا گیا (۴۱۱) اور
دکھایا گیا کہ اسلام کے مطابق جب خدائی راگ چھیڑا جاتا
ہے تو لوگوں کو وجد آ جاتا ہے اور وہ کھڑے ہو کر ناچنے
لگتے ہیں۔ اسی طرح مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بعض معاملات
میں قرآن کے بیانات متضاد (CONTRADICTORY)
ہیں۔ مثال کے طور پر کبھی قرآن کہتا ہے کہ انسان کو عمل
کی آزادی حاصل ہے، اور کبھی قرآن ہی یہ زور دیتا ہوا
دکھائی دیتا ہے کہ انسان کے تمام معاملات پر خدا کا مکمل
کنٹرول قائم ہے (۴۰۷) قرآن کی بابت مقالہ نگار نے
اعتراف کیا ہے کہ اس کے کسی ماقبل انسانی ماخذ کا ثبوت
نہیں ملتا (۴۰۲) حتیٰ کہ قرآن کی زبان بھی محمد کی اپنی روز
مرہ کی زبان سے مختلف ہے (۳۹۸) پھر بھی معروف رواج
کے مطابق انھیں تلاش ہے کہ سابق مذہبی کتابوں میں اس
کا کوئی ماخذ مل جائے۔ وغیرہ

یہ باتیں بلاشبہ ہمارے لئے تکلیف دہ ہیں۔
مگر اس قسم کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں، ان کا توڑ یہ نہیں
ہے کہ ان کے خلاف ایک جلی کٹی تنقید لکھ کر چھاپ دی
جائے یا ناشر اور مصنف کے نام احتجاجی تار روانہ کر دیے
جائیں۔ اس قسم کی کوشش، خدمت اسلام کا جھوٹا کریڈٹ
لینے کے ہم معنی ہے۔ ان کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ
کچھ خبریں اخبار میں چھپ جائیں اور وہ بھی دینی نقصان
میں مالی نقصان کے اضافہ کی قیمت پر۔ کرنے کا اصل کام
یہ ہے کہ ان کتابوں کا علمی بدل فراہم کیا جائے، ہمارے
درمیان اعلیٰ سطح پر ایسے ادارے قائم ہوں جو خود علوم
کو نئے ڈھنگ پر مرتب کر ڈالیں۔ موجودہ قسم کی اشتہاری
کتابوں کے بجائے وہ علمی طرز کی کتابیں تیار کریں، اسلام
کی قلمی خدمت کے کام کو مناظرہ بازی یا دوسرے لفظوں میں
"مذہب کے پروپگنڈہ لٹریچر" کی سطح سے اٹھا کر تدوین علوم
کی سطح پر پہنچا دیں۔ وہ انسانی ذہن کو تحقیق و تصنیف کے اس
مقام پر پہنچ کر خطاب کریں جہاں سے دوسرے لوگ اس کو
خطاب کر رہے ہیں۔ دوسری کوئی بھی صورت اس فتنہ کے
مقابلہ کی نہیں ہے۔

تعارف و تبصرہ:

صیانۃ الحدیث حصہ اول (صفحات ۳۲۸)
" " حصہ دوم (صفحات ۲۰۰)
از مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری
قیمت ہر دو حصے نو روپے پچاس پیسے
پتہ: مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری،
معرفت خان کلاتھ ہاؤس۔ رام دت گنج۔ ضلع بستی

العلم والعلماء از مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری
صفحات ۱۰۴۔ قیمت دو روپے (پتہ مذکورہ بالا)

دونوں کتابوں کا موضوع ان کے نام سے ظاہر ہے۔
منکرین حدیث کا اعتراض ہے کہ احادیث رسول ڈھائی سو برس
بعد مرتب کی گئیں۔ اس لئے وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔
صیانۃ الحدیث میں اس الزام کا مفصل جواب تاریخ و واقعات
کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ دوسری کتاب (العلم والعلماء) میں
طلب علم کے سلسلے میں علمائے سلف کی جدوجہد کے عبرت انگیز
واقعات درج ہیں۔ موصوف نے دیباچہ میں لکھا ہے:
"حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اپنی تصانیف میں سے صرف
فتح الباری اور مقدمہ فتح الباری کے تیار کرنے پر سب سے زیادہ
خوش ہوں۔ میں بھی اپنے تازہ مضامین میں "سیرت پاک" پر لکھے
ہوئے مقالہ اور نصرت حدیث پر لکھے ہوئے مضمون "صیانۃ الحدیث
اور نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری" سے سب سے زیادہ مطمئن ہوں"

مومن کی تصویر

آج کا یہ اجتماع جس میں ہم آپ جمع ہوئے ہیں، یہ گویا ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے جماعت اسلامی کی دعوت پر ملک کے گوشے سے یہاں جمع ہو کر آپ نے اس بات کا مظاہرہ کیا ہے کہ پچھلے پندرہ سال کے اندر ہم اس ملک میں کتنا کام کر چکے ہیں اور یہاں جو کارروائی انجام پائے گی وہ ہماری طرف سے اس بات کا اعلان ہو گا کہ آئندہ ہم اس ملک میں کیا کرنا چاہتے ہیں یہ گویا ماضی اور مستقبل کے درمیان کا ایک وقفہ ہے جس کو ہم دارالسلطنت یا قرآن کے الفاظ میں اس ملک کے ام القریٰ میں گزار رہے ہیں۔ اس وقت میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ہمارے اس تاریخی دن کے دوسرے پہلو کا ایک جزء ہے۔ خدا میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

حضرت معاذؓ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایک گفتگو کی روداد ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دین کا سرا کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی سب سے بلند چوٹی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا، "ہاں اے خدا کے رسول"، آپ نے فرمایا۔ دین کا سرا اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔

اس حدیث کے مطابق دین کے تین درجے ہیں — اسلام، نماز، اور جہاد —— یہ تین الفاظ دراصل تین مختلف عمل کے عنوانات ہیں جو ایمان لانے کے بعد کسی کی زندگی میں ابھرتے ہیں۔ اسلام اس کا پہلا عمل اور اس کی بنیاد ہے اور نماز وہ چیز ہے جو اس عمارت کو اوپر اٹھاتی ہے اور جہاد اس کی آخری منزل ہے۔

سب سے پہلے اسلام کو لیجیے۔ اسلام کے معنی سپردگی اور حوالگی کے ہیں۔ بندہ جب اپنے خدا کو پالے اور اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالے کر دے تو اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا فنا فی اللہ ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور جسمانی طور پر اپنے الگ وجود کو باقی رکھتے ہوئے نفسیاتی طور پر خدا کی ہستی میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی کے پورے وجود کا خدا کے تصور میں ڈھل جانا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ہمارا ذہن اس حقیقت پر بالکل مطمئن ہو جائے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے، ہمارے احساسات میں وہ اس طرح شامل ہو جائے کہ رگ رگ میں ہم اس کی کھٹک محسوس کرنے لگیں۔ ہم اپنے آپ کو اس طرح اس کے حوالے کر چکے ہوں کہ کسی معاملے میں اس کے خلاف جانے کا تصور تک نہ کر سکیں۔ ہمارا ذہن اسی کے بارے میں سوچتا ہو اور ہمارے جذبات اسی کے لیے متحرک ہوتے ہوں۔ ہم سب سے زیادہ اس سے ڈرتے

ہوں اور سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہوں۔ جس شخص کی یہ کیفیت ہو جائے وہی دراصل اسلام کو قبول کرتا ہے۔ اسلام تسلیم و تفویض کی وہ آخری قسم ہے جس میں بندہ اپنے فکر کو، اپنے جذبات کو، اپنے وجود کو اور اپنے سارے اثاثے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے پاس کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ہے وہاں اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ خدا مجھ سے میرے لڑکے کی قربانی مانگ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً لڑکے کو لیا اور اس کو لٹا کر اس کی گردن پر چھری رکھ دی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ
(صافات ۱۰۳)

جب وہ دونوں مسلم ہوئے اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل ڈال دیا۔

حضرت ابراہیم کا یہ عمل اسلام کی حقیقی تصویر ہے۔ یہ حوالگی اور سپردگی کی انتہا ہے کہ خدا کی طرف سے جو حکم بھی آئے بندہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو محسوس ہو کہ اس سے اپنے لڑکے کو ذبح کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے تو وہ بے تکلف اپنے لخت جگر کو زمین پر لٹائے اور اس کی گردن پر چھری چلا دے۔

یہی اسلام خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ جب آدمی اس طرح مسلم اور مطیع ہو جائے تو وہ دین کا سرا پکڑتا ہے۔ اس مکمل حوالگی کے بغیر کسی کی زندگی حقیقی معنوں میں خدا پرستانہ زندگی نہیں بن سکتی۔ اس حوالگی میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آدمی کی زندگی میں کمی رہ جائے گی۔ مثلاً ایک شخص نے اگر اپنے ذہن کو خدا کے حوالے کیا ہے مگر اس کے احساسات پر خدا کا غلبہ نہیں ہوا ہے تو وہ اسلام کا صرف ایک وکیل بن کر رہ جائے گا۔ وہ اسلام کے لیے بحثیں کرے گا اور دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہوگی۔ مگر اس کی اپنی زندگی خدا پرستی سے خالی ہوگی۔ کوئی شخص اگر اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا نفع حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ خدا پرستی کو اسی حد تک اختیار کرے گا جس حد تک اس کے دنیوی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ جہاں اس کا دنیا کا فائدہ خطرہ میں نظر آیا وہ خدا پرستی کو ترک کر دے گا اور دنیا کے بت کو پوجنے لگے گا۔ جو شخص کسی سطحی تاثر یا وقتی جذبات کے تحت اسلام کی طرف مائل ہوگا وہ چند دنوں تو بڑی سرگرمی دکھائے گا مگر اس کے بعد ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ یا جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا جائے گا۔ جو شخص اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ اپنی خودی کے بت کو بھی ساتھ لیے ہو وہ خدا کے دین کی ان چیزوں کو بڑی خوشی سے لے لے گا جو اس کے ذوق کے مطابق ہوں گی اور جو چیز اس کے ذہنی سانچے میں فٹ نہ ہوگی وہ اسے رد کر دے گا۔ جو شخص اسلام کے ناقص مطالعہ کے تحت محض اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف آئے وہ اپنے پسندیدہ پہلوؤں کے بارے میں تو اتنی گرما گرم تقریر کرے گا گویا وہ صحابۂ کرام سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ مگر دوسرے پہلوؤں سے اسے کچھ زیادہ

دل چسپی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کو اپنے قومی اور تحریکی جذبات کی تسکین کے لیے اختیار کرے تو وہ قومی جوش وخروش اور تحریکی اخلاقیات میں تو بہت نمایاں نظر آئے گا۔ مگر حقیقی اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاقیات کا اس کے اندر کہیں پتہ نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جو لوگ مکمل حوالگی کے بغیر دین کی طرف آئیں ان کی کمزوریاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں کہ ایک شخص کو صبح سات بجے کسی دینی کام کے لیے بلایا جائے گا اور وہ کہے گا کہ میں اتنے سویرے نہیں آسکتا کیونکہ وہ میرے چائے پینے کا وقت ہے۔ ایک شخص کو کسی اسلامی اجتماع کے پروگرام میں حصہ لینے کے لیے رات کو گیارہ بجے کا وقت دیا جائے گا اور وہ جواب دے گا کہ گیارہ بجے تک میرے لیے سوجانا ضروری ہے۔ اس لیے میں اس پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالےٰ نے تم کو جو صلاحیت دی ہے اس کو دین کی خدمت میں لگاؤ مگر وہ کہے گا کہ میں تو دنیا کی خدمت کروں گا کیونکہ دنیا کے بازار میں میری صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہر وقت کھانے کپڑے کی فکر میں مبتلا رہے گا، اس کی مجلس میں ہر وقت روپے پیسے کا تذکرہ ہوگا اور جب اس سے کہا جائے گا کہ مومن کے گھر میں خدا اور آخرت کا چرچا ہونا چاہئے تو وہ بگڑ کر بولے گا کہ ”ہاں یہ مومن کا نہیں کافر کا گھر ہے“۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرے گا لیکن اگر اس کی روزانہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے زیادہ اس کا ذہن اپنے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتا ہے، وہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے زیادہ نجی قسم کے مشغلوں میں اپنا وقت صرف کر رہا ہے، وہ اپنی معاش کمانے اور اپنے بیوی بچوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تو سارے جتن کرتا ہے مگر اسلام کا کوئی کام کرنا ہو تو معمولی معمولی باتوں کو عذر بنالیتا ہے۔ اس قسم کی کمزوریاں جہاں نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ آدمی کے اندر مکمل حوالگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے دین کی طرف نہیں آیا ہے۔ اس نے ادھوری شکل میں اسلام قبول کیا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں چند مخصوص چیزوں کو ”اسلام“ کہا گیا ہے۔ مثلاً حدیث جبریل میں ہے کہ آپ سے پوچھا گیا: ”اے محمدؐ! بتائیے اسلام کیا ہے؟“ آپؐ نے جواب دیا ”اسلام یہ ہے تم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرطِ استطاعت بیت اللہ کا حج کرو“ اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جن کو دیکھ کر بظاہر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید یہی وہ چند چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ مگر اس قسم کا شبہ وہی کر سکتا ہے جو ان احادیث کو پوری شریعت سے الگ کرکے دیکھے۔ قرآن و حدیث کی ساری تعلیمات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چند چیزیں کل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کے چند علامتی پہلو ہیں۔ کلمۂ توحید کا اقرار اپنے اندر ایک فکری انقلاب کا اعتراف ہے۔ نماز اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے آگے جھک گیا ہے۔ زکوٰۃ اپنے مال و اسباب کو خدا کے لیے وقف کر دینے کا اعلان ہے روزہ اس بات کا

عزم ہے کہ بندہ اپنے رب کی خاطر ساری مشقتیں جھیلنے کے لیے تیار ہے اور حج گویا آدمی کی طرف سے اس بےقراری کا اظہار ہے کہ وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلمۂ توحید اور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ بذات خود مکمل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے پیدا ہونے والی اندرونی کیفیات کے چند نشان ہیں۔ یہ مکمل حوالگی کی جزوی تصویر ہے نہ کہ انھیں کا نام مکمل حوالگی ہے۔

یہ چیزیں جن کا حدیث میں ذکر ہے یہ شریعت کی وہ مخصوص چیزیں ہیں جن کو ہمارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے اور فرائض کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ راستے کی حد نہیں ہیں بلکہ وہ صرف راستے کی سمت بتاتے ہیں۔ یہ فرائض ایک طرح کی لازمی تربیت ہیں جو ہم کو مخصوص وقتوں میں ایک مقررہ عمل کرا کے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ بقیہ وقت میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ان کی حیثیت محض علامات کی ہے نہ کہ ذمہ داریوں کے حدود متعین کرنے کی۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں جب ہندوستان میں چینی جارحیت کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ احمد آباد کے ۲۵ ہزار طلبہ نے یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے دفاع کے لیے لڑیں گے اور اپنی جان دے کر چینی حملہ کا مقابلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ان میں سے ہر شخص نے ایک ایک پیسہ دے کر ۲۵ ہزار پیسے جمع کیے اور ان کو ہندوستانی وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسے دیتے ہوئے انھوں نے وزیر اعظم سے کہا کہ یہ ہماری طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے TO GIVE OURSELVES TO YOU کا نشان ہے۔ یہ وقت کی ایک مثال ہے جس سے ہم اسلامی فرائض کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ بندہ فرائض اور واجبات کی شکل میں اپنے وجود کا تھوڑا حصہ خدا کو دے کر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اپنا پورا وجود خدا کو دینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اپنی بعض حیثیتوں میں سے "کچھ" دے کر تمام حیثیتوں سے اپنا "سب کچھ" اس کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔

اب نماز کو لیجیے جو اس سلسلے کی دوسری چیز ہے۔ جب کوئی شخص مکمل حوالگی کے ساتھ خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے بالکل قدرتی نتیجے کے طور پر اس کی پوری زندگی ذکر اور دعا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی ذکر اور دعا کی ایک مخصوص صورت کا نام نماز ہے۔ اہل ایمان کی تعریف قرآن میں يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (سجدہ - ۱۶) کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمتوں کی تمنا کرتے ہوئے اسے پکارتے رہتے ہیں۔ جن واقعات کو دیکھ کر لوگ دوسری چیزوں کو یاد کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مومن خدا کے تصور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی جنازے میں شرکت کے لیے قبرستان جاتا ہے تو یہ موقع اس کے لیے بستی کے لوگوں سے ملاقات کی تقریب نہیں ہوتی بلکہ کھودی جانے والی قبر اس کے لیے ایک کھلا ہوا دروازہ بن جاتی ہے جس سے وہ آخرت کی حقیقتوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اگر وہ کسی عالیشان مکان میں اپنے آپ کو پائے تو وہ اس کے نقش و نگار دیکھنے میں محو نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا! مجھے ایسا مکان

نہیں چاہیے، میں تو تیری رحمت اور مغفرت کا طلب گار ہوں اور وہی تو مجھے دے دے۔ اگر وہ کسی تاریخی کھنڈر کے سامنے کھڑا ہو تو وہ اس کو محض آثار قدیمہ کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اس سے یہ عبرت حاصل کرتا ہے کہ ان آبادیوں کے بسنے والے اپنی آبادیوں کو چھوڑ کر جس دنیا میں چلے گئے ہیں وہیں مجھ کو بھی جانا ہے۔ اگر وہ کسی جدید طرز کے کارخانے میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کام پہلے سخت قسم کی انسانی محنت سے انجام پاتا تھا، اس کو تیز رفتار مشینیں انجام دے رہی ہیں اور انسان ان کے سامنے کھڑا ہوا صرف ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے تو اس کو "صنعتی انقلاب" کے عجائب یاد نہیں آتے بلکہ وہ کارخانے کی شکل میں خدا کے انعامات کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اسے ضرورت تھی، تو نے اسے ایک ایسی کائنات دی ہے جو اپنے ساز و سامان کے ساتھ گویا اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ انسان آکر ایک بٹن دبا دے اور ساری کائنات اس کی خدمت کے لیے حرکت میں آجائے۔

اسی طرح وہ خود جتنے عمل کرتا ہے وہ بھی خدا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کا ہر عمل اپنے رب سے درخواست ہے جب وہ کسی کی عیب پوشی کرتا ہے تو گویا وہ خدا سے اس کا متمنی ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائے۔ جب وہ کسی کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے اور اس کے حق سے زیادہ اسے دیتا ہے تو درحقیقت وہ دعا کرتا ہے کہ مالک حقیقی اس کے ساتھ بھی اسی طرح فیاضی کا معاملہ کرے۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنے بچے کو گود میں لیتا ہے تو اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا یہ بچہ جتنا کمزور ہے میں اس سے زیادہ تیرے سامنے بے بس اور کمزور ہوں تو میری مدد فرما! وہ کہتا ہے کہ میرے رب! جس طرح ایک چھوٹا بچہ ہمکتا ہے تو شفیق باپ لپک کر اسے اٹھا لیتا ہے اسی طرح میں تیری طرف آنا چاہتا ہوں، مگر اپنے کمزور قدموں کے ساتھ میں تجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھالے!

نماز درحقیقت اسی مومنانہ زندگی کا نشان اور اس کا مرکزی نقطہ ہے۔ مومن کی پوری زندگی نماز ہوتی ہے، مخصوص اوقات میں جب وہ نماز پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی حالت نماز میں ہونے کی حیثیت کو مجسم اور مکمل کرتا ہے۔ نماز بندگی کی تصویر ہے۔ نماز اپنے رب سے قریب ہونے کی کوشش ہے۔ نماز خدا کے دربار میں حاضری کا وقت ہے۔ نماز ان جذبات کا ایک خارجی مظہر ہے جو مومن کے سینے میں تڑپ رہے ہوتے ہیں نماز ایک لحاظ سے دعا ہے، وہ اپنی عاجزی کو پیش کر کے خدا سے اس کی رحمت و مغفرت مانگنا ہے اور دوسرے لحاظ سے وہ اسی قسم کا ایک بیتابانہ عمل ہے جو ایک شخص اپنے محبوب دوست کے لیے کرتا ہے جب کہ وہ اس سے بچھڑ گیا ہو اور تصور کی دنیا میں اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نماز خدا کا اپنے بندے کی طرف آنا اور بندے کا اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔ بندہ جب نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ دوسری تمام حالتوں کے مقابلے میں خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے چنانچہ نماز کے وقت اس کو ایک خاص طرح کی قربت کا احساس

ہوتا رہتا ہے مگر جوں ہی نماز پوری کرکے وہ سلام پھیرتا ہے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ایرکنڈیشنڈ عمارت سے یکایک باہر آگیا ہو۔ مختصر یہ کہ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے جس طرح جنت کی زندگی کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنتیوں کو خدا کا دیدار کرایا جائے گا تو وہ جنت کے بہترین آرام وعیش بھول جائیں گے اور انھیں محسوس ہوگا کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح کیفیت سے بھرا ہوا ایک سجدہ، ایسا سجدہ جس سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ ایسے سجدوں والی نماز ہی حقیقی معنوں میں نماز ہے اور جس کو ایسے سجدوں کی توفیق نہیں ہوئی وہ گویا ابھی تک نماز سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ ایسے شخص سے میں خدا کے رسول کی زبان میں کہوں گا کہ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ ــ (جاؤ اور پھر سے نماز پڑھو، کیونکہ تم نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی)

حدیث میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ یہ نماز کے تربیتی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ نماز مومن کی تربیت ہے۔ ایک طرف وہ آدمی کے اندر وہ خصوصیات پیدا کرتی ہے جن سے وہ دین کا حامل بن سکے۔ اور دوسری طرف وہ آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ حق کا علمبردار بن کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو۔ نماز کے یہ دونوں فائدے سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

(مزمل : ۱ - ۸)

اے چادر اوڑھنے والے، راتوں میں قیام کر تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ ہم تم پر ایک بھاری بات آتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھنا نفس کو خوب کچلتا ہے اور ایسی حالت میں جو بات نکلتی ہے وہ بھی بہت درست ہوتی ہے۔ دن کے وقت تمہیں لمبی مشغولیت ہوتی ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کا ہو جا۔

ان آیات میں نماز کے ایک پہلو کو وَطْأً شدید کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمی مقال اقوم (درست گفتگو) کے قابل بنتا ہے اور اس کے دوسرے پہلو کو ذکرِ اسمِ رب کہا گیا ہے جس سے تَبَتُّل اِلَی اللّٰہِ (خدا کی طرف یکسوئی) کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اہل ایمان کے اوپر حق کی تبلیغ کرنے کی جو ذمہ ڈالی ہے وہ ایک نہایت گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اوپر کے ٹکڑے میں قولِ ثقیل کہا گیا ہے۔ اس قول ثقیل کا بوجھ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زبردست ریاضتیں کرکے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرے جس سے اس کا بوجھ اٹھانا آسان ہو جائے۔ اس ریاضت

کا طریقہ لمبی قرأت والی طویل نمازیں ہیں جن کا بہترین وقت رات کی تنہائی ہے۔ رات میں کھڑے ہوکر نماز پڑھنا ایک بڑا مشقت کا عمل ہے جس کو یہاں وطأ شدید (بہت روندنا) کہا گیا ہے۔ اس وطأ شدید کے ذریعہ مومن اپنے نفس کو کچلتا ہے اور اس حالت میں قرآن پڑھ کر اپنے ذہن کو صاف اور دل کو پاک کرتا ہے۔ اس طرح تربیت پاکر وہ انسان تیار ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف رکھنے والا ہو اور مقابل اقوام کے ساتھ تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکے۔ رات کو خدا کے سامنے کھڑا ہونا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دن کو بندگان خدا کے سامنے کھڑا ہو، اور خدا کے کلام کے مطالعہ سے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول سکے۔

نماز کا دوسرا پہلو ذکر اسم رب ہے جو تبتل الی اللہ کی کیفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی خدا کی یاد میں اس قدر مشغول ہونا کہ ذہنی حیثیت سے آدمی ایسا ہو جائے گویا وہ دنیا سے کٹ کر خدا سے جڑ گیا ہے۔ یہ نماز صرف یاد کی شکل میں بھی ہوتی ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر کہا گیا ہے اور قیام و قعود اور رکوع و سجود کی شکل میں بھی جو نماز کی مخصوص صورت ہے۔ آدمی جب دن کے وقت اپنی مشغولیتوں میں خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور جب مخصوص اوقات کے آتے ہی وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں مسجد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادی دنیا سے ہٹا کر روحانی دنیا کی طرف لے جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کی دلچسپیوں سے اس قدر بے تعلق ہو جائے گویا کہ وہ خدا کا راہب بن گیا ہے۔ اس طرح ذکر اور نماز آدمی کو مادی آلائشوں سے پاک کرکے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دنیا کے اوپر آخرت کو ترجیح دے سکے۔ فانی دنیا کو چھوڑ کر باقی رہنے والی دنیا میں اپنا دل لگائے۔

خدا کی راہ میں نفس کو کچلے بغیر آدمی کے اندر وہ سوز پیدا نہیں ہو سکتا جو دعوت حق کی جان ہے اور نہ اس کے بغیر کسی کو موعظۂ حسنہ کی وہ زبان حاصل ہو سکتی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ داعی کی زندگی سراپا اپنے نظریات کا مجسمہ بن گئی ہو۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلیں وہ محض الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی اپنی زندگی ان کے اندر کھنچ آئی ہو۔ دعوت حق کے کام کے لیے علمی قابلیت کی ڈگریاں درکار نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایسی زندگی کی ضرورت ہے جو اپنی ترجمان آپ ہو، جو بولنے سے پہلے بول رہی ہو۔ اس کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو اس غم میں گھل رہا ہو کہ لوگ اپنے رب کو بھول گئے ہیں۔ جو ساری فکروں کو چھوڑ کر اس فکر میں دیوانہ ہو جائے کہ کس طرح لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے کی طرف لگایا جائے اور آدمی کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کرنے والا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نماز ہے ایسی نماز جس میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ یہ نماز داعی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ نماز کو اپنی زندگی میں شامل کیے بغیر حق کا داعی بن سکتا ہے تو یہ محض ایک غلط فہمی ہے اور جتنی جلد وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے اچھا ہے۔

نماز کی اسی اہمیت کی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں تمام عمال کے نام ایک مکتوب

روانہ کیا جس میں یہ درج تھا کہ :-

اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِکُمْ عِنْدِیْ الصَّلٰوۃُ مَنْ حَفِظَھَا وَ حَافَظَ عَلَیْھَا حَفِظَ دِیْنَہٗ وَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ ۔ (مالک)	تمہارے معاملات میں سب سے اہم چیز میرے نزدیک نماز ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے گا اور اس پر قائم رہے گا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا اور جو شخص نماز کو ضائع کر دے وہ دوسری چیزوں کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہو گا۔

تیسری چیز جہاد ہے ۔ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جس طرز زندگی کو خود اختیار کیا ہے اسی کی طرف دوسروں کو لانے کی کوشش کرے ۔ دعوت حق اور جہاد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک لفظ سے اس کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کی کیفیت کا ۔ یا ان دونوں کے فرق کو ہم اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دعوت اس کی ابتدا ہے اور جہاد اس کی انتہا ۔ ایمان لانا دوسرے لفظوں میں ایک حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ۔ اس حقیقت سے جب آدمی دوسروں کو آگاہ کرنا چاہے تو اسی کو جہاد کہتے ہیں ۔ یہ جہاد ابتدا زبان سے شروع ہوتا ہے مگر اپنے آخری درجے میں پہنچ کر داعی کو تلواروں کے سایے اور پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر حقیقت کا اعلان کرنا ہوتا ہے ۔ جو ان تمام مراحل سے گزر کر اپنی ساری کوشش امر حق کے اعلان و اظہار میں صرف کر دے ، وہی مجاہد فی سبیل اللہ ہے ۔

اس جہاد میں بظاہر دوسروں کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے مگر حقیقتاً یہ خود اپنے ساتھ جدوجہد کرنا ہے جو شخص اپنے آپ سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہو وہی دوسروں سے لڑ سکتا ہے ۔ جو اپنے آپ کو زیر کر سکے وہی دوسروں پر غالب آسکتا ہے ۔ داعی اور مجاہد بننے کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی خود اپنی زندگی میں اس چیز کو قائم کر چکا ہو جس کو وہ دوسروں کی زندگی میں قائم کرنے کے لیے اٹھا ہے ۔ وہ ان باتوں پر سب سے پہلے خود ایمان لائے جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہے ۔ وہ خود اس چیز کے لیے بیتاب ہو چکا ہو جس کی طلب وہ دوسروں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ جو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو جس کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے ۔ داعی کے سامنے ایک طرف اس کے مخاطب ہوتے ہیں ، دوسری طرف وہ دنیا ہوتی ہے جس کے حالات اسے لوگوں کو بتانے ہوتے ہیں ، اس لیے وہ انتہائی بلندی پر کھڑا ہوتا ہے تاکہ وہ سامنے کی دنیا اور پیچھے کی دنیا دونوں کو دیکھ سکے ۔ اپنی بات پر بے پناہ یقین اور خدا کے اوپر بے پناہ اعتماد ، یہی دو چیزیں خدا کے لیے کوشش کرنے والوں کا سرمایہ ہیں ۔ آپ حقیقی معنوں میں داعی اسی وقت بن سکتے ہیں جب آپ کا حال یہ ہو کہ آپ کسی غلط روش پر تنقید کریں تو درد کی شدت سے آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں ۔ آپ کی دعوتی تحریریں بازار سے خرید کی ہوئی روشنائی سے نہ لکھی گئی ہوں بلکہ اپنے خون سے تیار کی گئی ہوں ، جس میں آپ نے خود اپنے کو نچوڑ دیا ہو ۔ اسی طرح اگر آپ مقرر ہیں تو آپ کا حال یہ ہونا چاہیے کہ جب آپ اسٹیج پر

تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو آپ کا دل بے قرار ہو جائے اور آپ اپنے رب سے عرض کریں کہ "خدایا! جو کچھ تو آخرت میں ان کے سامنے کھولنے والا ہے اس کو میں دنیا میں ان کے سامنے کھولنا چاہتا ہوں۔ تو مجھے اس کی توفیق دے"۔ جو شخص اس مقام سے بول سکے وہی دراصل داعی بن سکتا ہے اور جس کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو اس کو جاننا چاہیے کہ وہ ابھی داعی بننے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اس کو دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھنے سے پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

لوگوں کو خدا کی طرف بلانا، دنیا میں نظام عدل قائم کرنا، شیطان اور طاغوت کے خلاف جنگ کرنا، یہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان ہیں۔ مگر یہی جہاد فی سبیل اللہ کا مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ جہاد اصل میں مومن کو مشکلات میں ڈال کر اس کا امتحان لینا ہے اور اس کو ایک ایسا موقع فراہم کرنا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی ارتقار کے لامحدود منازل طے کر سکے۔ جس طرح انسان کے مادی وجود کو باقی رکھنے اور اس کو نشو ونما دینے کے لیے زمین و آسمان کی بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے روحانی ارتقار کے لیے ایک وسیع میدان بلکہ پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ نظام اسلامی کا قیام اسی پھیلے ہوئے پروگرام کا ایک جزء ہے جو سماجی زندگی کے ساتھ مومنانہ کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا میں نظام حق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ جہاد کی تکمیل یہ ہے کہ آپ اپنی قوتوں کا آخری حصہ تک اس راہ میں صرف کر دیں۔ خدا کے یہاں جن لوگوں کا شمار انبیاء اور شہداء میں ہوگا ان میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جو ساری جدوجہد کے باوجود وقت کی سوسائٹی کو بدل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ایسے بھی لوگ ہوں گے جن کے پیغام کو اتنی بڑی اکثریت نے قبول کر لیا کہ وہ سوسائٹی کا دین بن گیا۔ یہ دونوں قسم کے لوگ خدا کے نزدیک کامیاب لوگ ہیں۔ ان کے درمیان خدا کے یہاں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ وہ سب کے سب یکساں اعزاز و احترام کے مستحق ہوں گے۔ کیونکہ جدوجہد کے نتیجہ کا تعلق دوسروں سے ہے نہ کہ جدوجہد کرنے والوں سے۔ جب خادم نے اپنا کام پورا کر لیا تو بہرحال وہ اپنی خدمت کا صلہ پانے کا مستحق ہو گیا۔ خواہ دوسرے لوگوں نے اس کی خدمت کو تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس جدوجہد کا پروگرام کیا ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ کو دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ واقعہ کہ جو حقیقت آپ کے اوپر منکشف ہوئی ہے آپ کے ماحول کے بے شمار لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ بس یہی آپ کے پروگرام کو متعین کر دیتا ہے۔ اسلامی شعور حاصل ہونے کے بعد جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی امتحان کی زندگی ہے اور ہر شخص جنت یا جہنم کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو آنے والے دن سے ہوشیار کریں۔ ہمارا جہاد یہ ہے کہ خدا کے عذاب سے دور بھاگنے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دیں۔

ہر روز جو سب سے بڑا واقعہ اس ملک میں پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مر جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لیے جن ایک لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں ان میں ہمارے ملک کے باشندوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں

سے ہر شخص کو موت آنی ہے مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھالیا جائے گا اور کون کل کے بعد ہمارا پیغام سننے کے لیے باقی رہے گا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے ہر زندہ انسان اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لیے سننے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لیے سنانے کا۔ یہ صورت حال خود بتا رہی ہے کہ آپ کے کرنے کا کام کیا ہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اس ملک کے ایک ایک شخص تک پہنچیں اور اس کو زندگی کے حقیقی مسئلے سے آگاہ کریں۔ اس ملک کی آبادی اگر چالیس کروڑ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو چالیس کرور کام کرنے ہیں۔ کیونکہ آج کا ہر انسان حقیقت سے غافل ہے، ہر آدمی اس بات کا محتاج ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔ موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے ایک ہی کام ہوگا۔ وہ یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب صورت حال یہ ہے تو انسانیت کی اس سے بڑی خدمت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کو اس اہم ترین حقیقت سے آگاہ کیا جائے اور خود اہل ایمان کی اس سے بڑی سعادت اور کیا ہے کہ وہ اپنی بہترین قوتوں اور صلاحیتوں کو اسی ایک کام میں لگادیں۔ جب آدمی کے پاس زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے مگر جس کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق یا کم تر درجے کے کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

یہ خدا کی طرف بلانا اور آنے والے سخت دن سے ہوشیار کرنا وہ سب سے بڑا انقلابی پروگرام ہے جس سے اب تک انسان واقف ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑے کسی عملی پروگرام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے پروگرام جو دنیا میں اختیار کیے جاتے ہیں وہ اپنے الفاظ اور اپنے نعروں کے لحاظ سے بہت بڑے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب نہایت حقیر اور محدود ہیں۔ ان کا دائرہ انسانی زندگی میں تھوڑی تھوڑی دور جا کر ختم ہوجاتا ہے اس کے مقابلے میں یہ نظریہ انسان کے اندر آخری حد تک سرایت کرتا ہے۔ وہ فساد کبیر کے خلاف جہاد عظیم ہے جو داعی کو سرتا پا مصروف بنا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ کام اپنی ابتدا میں ایک کام ہے مگر جب وہ عمل میں آتا ہے تو شاخ در شاخ پھیلتا ہوا ہزار کام بن جاتا ہے۔

جو لوگ کسی اقتدار کے خلاف جہاد کرنے اٹھتے ہیں ان کا کام اس وقت ختم ہوجاتا ہے جب وہ ایک حکمراں خاندان کو قتل کردیں یا چند سیاسی لیڈروں کو زیر کرکے ان سے حکومت کی کرسی چھین لیں۔ جب کہ یہ نظریہ ان تمام انسانوں کو فتح کرنا چاہتا ہے جو زمین کے اوپر چل پھر رہے ہوں ۔ سماجی اصلاح کے مجاہدین چند ادارے اور چند ہستیاں بنوانے کے بعد مطمئن ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا کام ہوگیا جب کہ یہ

نظریہ دلوں اور دماغوں کو بدل کر نئے قسم کے انسان وجود میں لانا چاہتا ہے جس سے زیادہ مشکل کوئی کام اس زمین کے اوپر نہیں ہے۔ معاشی اسکیمیں چند سال کی دنیوی زندگی کے لیے کچھ نشانے آدمی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ لامتناہی زندگی کی بے حساب کامرانیاں حاصل کرنے کے لیے آدمی کو متحرک کرتا ہے۔ ہر دوسرے کام کا ایک خاص میدان ہے، یہ میدان جہاں موجود نہ ہو وہاں اس کے کارکن بے دست وپا نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً اشتراکیت ایسے ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے جہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جھگڑے نہ ہوں۔ آزادی کی تحریک کے لیے اس وقت کرنے کا کچھ کام نہیں رہتا جب بیرونی آقا ہٹ گیے ہوں اور ان کی جگہ ملکی آقاؤں نے لے لی ہو۔ مگر اسلام کا جہاد ایک وسیع اور ہمہ گیر جہاد ہے جس کے لیے ہر وقت کرنے کا کام ہے اور ہر جگہ اس کے لیے کام کا میدان موجود ہے۔

یہ دعوتی جدوجہد اور خدا کی راہ میں آخری حد تک بڑھنے کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے جس کو حدیث میں "دین کی سب سے بلند چوٹی" کہا گیا ہے۔ جہاد اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ بندے کے لیے ایک ایسا میدان فراہم کیا جائے جہاں وہ اپنی تمام کوششوں کو خدا کی راہ میں لگا سکے۔ جہاد کی روح یہ ہے کہ بندہ اپنی کوششوں کو آخری حد تک صرف کر ڈالے تاکہ خدا اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر آخری حد تک لنڈھا دے۔ جہاد تکلیفوں اور دشواریوں کے میدان میں اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی اکثر اپنی کوتاہیوں کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کے خلاف جدوجہد کر کے آپ اپنے رب کو خوش کر سکتے ہیں۔ آپ جن ذاتی مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رک رہے ہیں، وہ دراصل آپ کے لیے ترقی کے زینے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں ہیں کہ آپ ان کو دیکھ کر رک جائیں — وہ اس لیے ہیں تاکہ آپ انھیں پھاند کر آگے بڑھ جائیں۔ خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تمناؤں کو اس کے لیے دفن کر دے، جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے، جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف چلا آئے۔ دنیا میں کسی شخص کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کر لے — کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا سب سے افضل جہاد کون سا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "وہ شخص جو اپنی بہترین سواری لے کر نکلا اور میدان جنگ میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود بھی شہید ہو گیا۔" گویا سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل لٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

محترم رفقا! یہ اجتماع جس میں آپ اس وقت شریک ہو رہے ہیں، اس کی بہترین تعبیر میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ آپ کی طرف سے تجدید عہد ہے۔ آپ نے جماعت میں شریک ہو کر پہلے دن اپنے رب سے جو معاہدہ کیا تھا، یہ اس معاہدہ پر آئندہ قائم رہنے کا عزم ہے جو آپ اپنے سیکڑوں رفقا کے سامنے کر رہے ہیں اور جس پر خدا

اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ اگر پچھلی مدت میں آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے والے ثابت ہوئے ہوں، اگر آپ کے دن اور آپ کی راتیں اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ آپ اپنے معاہدے میں پورے اترے ہیں تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس تجدید عہد کا موقع ملنا آپ کے لیے آپ کے رب کی طرف سے خوش خبری ہے۔ یہ آپ کی کوششوں کے قبول کیے جانے کا نشان ہے۔ اور اگر آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں آپ کو یہاں آنے کی توفیق دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا ایک اور موقع دیا گیا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کی اہمیت کو سمجھیں اور جو کچھ پہلے نہیں کر سکے اس کو آئندہ کرنے کا عزم لے کر یہاں سے واپس جائیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اپنی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتے ہیں اور اس زندگی کی مدت بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہمیں دیکھ رہے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کو دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ ہمارے سامنے آنے والا ہے اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجے سے دوچار ہوں گے جس کے بعد پھر کسی تیاری کا موقع ہم کو نہیں ملے گا۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، خوب سمجھ لیجیے کہ آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

خدا کا دین ہم سے ہماری زندگی مانگ رہا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنا پورا وجود اس کے سپرد کر دیں۔ ہمارے دن اور ہماری راتیں اس کے لیے وقف ہو جائیں اپنی طاقت کا آخری حصّہ تک ہم اس کی راہ میں لگا دیں۔ جو لوگ اس سرفروشانہ جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور جن کے اندر اپنے آپ کو قربان کر کے دین کی خدمت کرنے کا حوصلہ ہو، وہی دراصل دین کی خدمت کریں گے اور جن کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو وہ صرف اپنی خدمت کر سکتے ہیں۔ خدا کے دین کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ (ماہنامہ زندگی رام پور، رجب ۱۳۸۰ھ)

نوٹ: جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع بمقام دہلی میں کی گئی ایک تقریر، ۱۲ر نومبر ۱۹۶۰ء

"ہم سمجھتے ہیں کہ تمہارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے، ہمارے بزرگوں نے تم کو راندۂ درگاہ کر دیا ہے" ——— قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو اس قسم کی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ آج اگر کوئی شخص بے آمیز سچائی لے کر اٹھے تو اس کو بھی اسی قسم کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ تمثیل ہے نہ کہ واقعہ

حدیثیں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگوئیں ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک گفتگو کسی روایت میں اپنی پوری شکل میں نقل نہیں ہو پاتی۔ اس سے ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور اصل مدعا واضح نہیں ہوتا۔ مگر اسی گفتگو کی دوسری روایتوں کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے اور مدعا کو سمجھنے میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا۔

مثال کے طور پر ایک مشہور روایت ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم استوصوا بالنساء خیرا فان المرأة خلقت من ضلع (بخاری ومسلم)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی وصیت قبول کرو۔ کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

اِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلْعٍ (بخاری)

عورتیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں

حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے اس ٹیڑھی ہڈی سے پیدا کیا ہے جس کو پسلی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ غلط فہمی اس روایت میں اختصار الفاظ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ یہی روایت دوسری جگہ زیادہ مفصل صورت میں آئی ہے اور وہاں یہ اشکال باقی نہیں رہتا:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان المرأة کالضلع ان ذهبت تقیمها کسرتها وان ترکتها استمتعت بها علی عوج (بخاری ومسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو تو تم اس کو توڑ دو گے۔ اور اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو تو ٹیڑھے پن کے باوجود اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "پسلی" کا لفظ نسوانی فطرت کو بتانے کے لئے بطور تمثیل استعمال کیا تھا۔ مگر بعض روایات میں اختصار الفاظ کی وجہ سے اس کو حقیقی معنوں میں لے لیا گیا اور غیر ضروری سوالات پیدا ہو گئے۔

حقیقت پسندی

غزوۂ احد (۶۲۵ء) ہجرت کے تیسرے سال پیش آیا۔ یہ مقابلہ مدینہ کے شمال میں احد پہاڑ کے دامن میں ہوا اس لئے اس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے۔

اس مقابلہ میں اولاً مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ مگر اس کے بعد ایک غلطی سے فتح شکست میں تبدیل ہو گئی حتیٰ کہ خود پیغمبرؐ بھی زخمی ہو گئے۔ جنگ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک مقام پر تھے کہ ابوسفیانؓ نے قریب آکر آواز دی:

فی القوم محمد

کیا تم لوگوں میں محمد ہیں

آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا اس کو جواب نہ دو۔ پھر اس نے پوچھا، کیا تم میں ابوبکرؓ ہیں۔ اس کے جواب میں بھی آپ کے ساتھی خاموش رہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں۔ اس کا بھی کچھ جواب نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد وہ بولا: معلوم ہوتا ہے کہ سب قتل ہو گئے۔ اب حضرت عمرؓ سے چپ نہ رہا گیا، وہ بولے:

اے دشمن خدا یہ سب زندہ ہیں اور تو رسوا ہوگا

ملت کا مسئلہ پہلے فرد کی سطح پر حل کرنا پڑے گا۔

ایک شخص بائیسکل سے سفر کر رہا تھا کہ اس کا بریک جام ہوگیا۔ وہ اتر کر سائیکل ساز کے پاس گیا اور اس سے مرمت کرنے کے لئے کہا۔ مسافر کا خیال تھا کہ جس مقام پر بریک جام ہوا ہے، سائیکل ساز اسی مقام پر ہاتھ لگا کر اس کو درست کرے گا۔ مگر اس نے ہتھوڑا لیا اور سائیکل میں بالکل دوسرے مقام پر ٹھونکنا شروع کر دیا۔ مسافر ابھی اپنی حیرت کا اظہار بھی نہیں کر پایا تھا کہ مستری نے کہا "بس ٹھیک ہے، لے جایئے۔" اگلے لمحہ سائیکل اپنے مسافر کو لئے ہوئے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

اسی پر اصلاح ملت کے معاملہ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہے، ان میں کوئی تعمیری سیاست نہیں ہے، وہ متحارب ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ مسائل کے بارے میں ان کے درمیان کوئی متفقہ پالیسی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں کے یہ حالات جب ایک دردمند شخص کے سامنے آتے ہیں تو وہ فوراً اجتماع اور کنونشن کی اصطلاحات میں سوچنے لگتا ہے۔ اس کو کام یہ نظر آتا ہے کہ تمام مسلمانوں کو جمع کر کے اتحاد کی قرار دادیں پاس کی جائیں۔ اور اسلام کے اوپر ولولہ انگیز تقریریں کی جائیں۔ مگر اس قسم کی سوچ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ جہاں پیدا ہوا ہے، وہیں ہم اس کو حل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ کہیں پیدا ہوتا ہے اور اس کے حل کا راز کہیں اور ہوتا ہے۔ پھل حاصل کرنے کے لئے جو شخص جڑ سے چلے، وہی پھل کا مالک بنتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص پھل سے چلنا چاہے، اس کے حصہ میں نہ پھل آئے گا اور نہ جڑ۔

مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی سوچ کو بدلیں۔ ہم پیچھے ہٹنے کے لئے تیار ہوں۔ مسئلہ کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ سارے مسلمانوں کو "اتحاد کانفرنس" میں جمع کر کے اتحاد ملت کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا آغاز اپنے قریبی دائرہ میں سنجیدہ اور خاموش عمل سے ہوگا۔ مسئلہ اگرچہ ملت کی سطح پر پیدا ہوا ہے مگر اس کو فرد کی سطح پر حل کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملت کی سطح پر مسائل کے حل کے امکانات پیدا ہوں۔

ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ باہر کی طاقت نہیں ہے۔ بلکہ خود ہمارے رہنماؤں کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صرف انھیں کاموں کے لئے متحرک ہوتے ہیں جن کے اندر "نیوز ویلو" ہو جس میں ان کی ذات کے لئے نمایاں ہونے کے مواقع ہوں۔ اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی رہنما خاموش تعمیری کام میں اپنے کو لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خود تو شہرت اور عزت کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا ہے اور دوسروں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ تعمیری کام کریں۔ اس طرح کبھی کوئی نتیجہ خیز کام نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کی تمام تقریریں محض لیڈری کی نمائش ہیں نہ کہ ملت کی تعمیر و اصلاح۔

مؤلفہ :
مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اداروں، طالب علموں، نیز کم آمدنی والوں کے لئے غیر معمولی رعایت
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

کتاب کی روانگی کا خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

AL-DARUL ILMIYYA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

الاسلام پر دو تبصرے

(۱)

مذہب اسلام کو آج کل کے سائنسی دور میں کس طرح سمجھنا اور سمجھانا چاہئے۔ یہ اس کتاب کا موضوع اصلی ہے۔ ساتھ ہی آج کل سیاسی اور معاشرتی حالات کے جو تقاضے درپیش ہیں ان کا دینی نقطۂ نگاہ سے کس طرح رد و قبول کیا جائے، مصنف نے ان تمام امور پر نہایت عالمانہ طور سے روشنی ڈالی ہے۔ مطالعہ اور علمیت کے ساتھ ان کی قوتِ استدلال نیز انداز بیان بصیرت عطا کرتا ہے۔ آج کل کے ہر روشن خیال مسلمان کو اس کتاب میں فکر و نظر کا سامان ملے گا۔

قومی آواز (لکھنؤ) ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۷

(۲)

مولانا وحید الدین خاں ہمارے ملک کے ان چند فکر مندوں میں سے ہیں جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر سکتے ہیں۔ وہ مغرب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عصری تقاضوں سے واقفیت رکھتے ہیں اور جہاں ایک طرف مغرب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں وہیں دوسری طرف اس کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کا فکری دیوالیہ پن بھی مہارت فن کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ "الاسلام" سے قبل ان کی ایک بہت کار آمد کتاب "علم جدید کا چیلنج" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں انھوں نے "جدید چیلنج" کو قبول کر کے اس کا بھرپور جواب دیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "الاسلام" بھی موجودہ سائنسی دور کی رعایت کر کے ہی لکھی گئی ہے۔ موجودہ دور میں دین کو سمجھنے اور سمجھانے کا انھوں نے اس میں طریقہ بتایا ہے۔ موجودہ دور کی بہت سی سیاسی و معاشی اصلاحات کو انھوں نے قبول کیا ہے اور بہت سی اصلاحات کو قطعی ناقابل اعتنا گردان کر ٹھکرا دیا ہے۔ مگر یہ قبول و انکار باقاعدہ اور مدلل ہے۔

"تعارف مسئلہ" کے ایک ذیلی عنوان "اسلامی ادارے" کے تحت مصنف نے موجودہ دور کے تین اسلامی اداروں خانقاہ، مدرسہ، اور جماعت کا جائزہ لیا ہے اور مجموعی طور پر تینوں کو اپنے مقاصد میں ناکام قرار دیا ہے کیونکہ مصنف کے خیال کے مطابق یہ ادارے ان فرائض کو ادا نہیں کر رہے ہیں جو ان کے قیام کے ساتھ ہی ان پر عائد ہوتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان اداروں نے اپنی تاثیر کھو دی، مگر فاضل مصنف نے صرف اسی قدر بیان پر اکتفا کر کے تنقید کا حق تو ادا کر دیا البتہ اصلاح کی بات نہ ہو سکی، جب کہ ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی کہ وہ بتائیں کہ اب اس روایتی نظام کو تبدیل کرنے کی کیا شکل ہوگی، کیونکہ کم از کم خانقاہیں اور مدرسے "ایک نظام" کے پابند ہیں اور اس سے بغاوت ان کے لئے دشوار مسئلہ ہے اس دشواری کو وہ کس طرح عبور کریں۔

مجموعی طور پر "الاسلام" نہایت ہی کار آمد اور تحقیقی کتاب ہے، مصنف "الاسلام" سے جا بجا فکری طور پر اختلاف کی تو گنجائش ہے مگر ان کی تحقیق و جستجو اور وسیع مطالعہ سے مجال انکار نہیں ہے اور یہ تلاش و محنت بغیر کسی فکر اور درد کے نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ بات بھی پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی تحریر ان کی دلی تڑپ کی غماز ہے۔

آج کے روشن خیال افراد اور مغربی دنیا کے دلدادہ مسلمانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔ (ماہنامہ البدر، کاکوری، اکتوبر ۱۹۷۷)

ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں

ایک حدیث ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الایمان بضعٌ وسبعونَ شعبۃ، فافضلھا قول لا الٰہ الا اللہ، وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق والحیاءُ شُعبۃٌ من الایمان

(رواہ الستہ وغیرہم بالفاظ مختلفۃ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کا کہنا ہے اور سب سے کم راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے۔ اور حیار بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

اس حدیث میں "ستر" کا عدد محض زیادتی کے مفہوم کو بتانے کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایتوں میں دوسرے اعداد بھی آئے ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ۷۷ کا عدد بتایا گیا ہے۔ مگر لوگوں کو ہمیشہ یہ شوق رہتا ہے کہ حقیقتوں کو مقداری اصطلاحوں میں بیان کر سکیں، اس لئے بہت سی طبیعتیں اس تلاش میں لگ گئیں کہ وہ ستر شاخوں کی گنتی کریں، حتیٰ کہ ان ستر شاخوں کے تعین کے لئے علمار نے بہت سی مستقل کتابیں لکھ ڈالیں۔ مثلاً فوائد المنہاج از ابو عبداللہ حلیمی، شعب الایمان از بیہقی، شعب الایمان از عبدالجلیل، کتاب النصائح از اسحاق بن قرطبی، وصف الایمان از ابو حاتم وغیرہ۔

امام ابو حاتم بن حبان فرماتے ہیں کہ میں ایک مدت تک اس حدیث کا مطلب سوچتا رہا۔ جب عبادتوں کو گنتا تو وہ ستر سے بہت زیادہ ہو جاتیں۔ احادیث میں چھان بین کرتا اور حدیث میں جن چیزوں کو نام لے کر ایمان کی شاخوں کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، ان کو گنتا تو وہ اس عدد سے کم ہو جاتیں۔ قرآن کی طرف متوجہ ہوا اور قرآن میں جن چیزوں کو ایمان کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، ان کو شمار کیا تو وہ بھی ستر سے کم نکلا۔

اس کے بعد میں نے قرآن اور حدیث دونوں کو جمع کیا۔ دونوں میں جن چیزوں کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے، ان کو گنا۔ جو چیزیں دونوں میں مشترک تھیں ان کو ایک ایک عدد شمار کر کے میزان نکالی تو دونوں کا مجموعہ، مکررات کو الگ کر کے، اس عدد کے موافق ہو گیا۔

کچھ دوسرے لوگ جو ساری کوششوں کے باوجود اپنی فہرستِ ایمان کو ۷۰ یا ۷۷ کے موافق نہ بنا سکے، انھوں نے کہہ دیا کہ اللہ ورسولہ اعلم۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ علمار کی ایک جماعت نے ان شاخوں کی تفصیل بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اجتہاد سے ان تفصیلات کے مراد ہونے کا حکم لگایا ہے، حالانکہ اس مقدار کی تعیین معلوم نہ ہونے سے ایمان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ خطابی لکھتے ہیں کہ اس تعداد کی تفصیل اللہ اور اس کے رسول کے علم میں ہے اور شریعت مطہرہ میں موجود ہے۔ اس لئے تعیین کے ساتھ ان کی تعداد کا معلوم نہ ہونا کچھ مضر نہیں۔ نووی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاخوں میں سب سے اعلیٰ توحید کو قرار دیا ہے اور سب سے نیچے جو ہے وہ دفع کرنا ہے اس چیز کا جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا احتمال رکھتی ہو۔ باقی سب شاخیں ان کے درمیان ہیں جن کی تفصیل معلوم ہونا ضروری نہیں۔ اجمالاً ان پر ایمان لانا کافی ہے، جیسا کہ سب فرشتوں

پر ایمان لانا ضروری ہے مگران کی تفصیل اور ان کے نام ہم نہیں جانتے۔

حقیقت کو مقداری اصطلاحوں میں بیان کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں ہے، اس کے بعد پورے دین کا تصور ہی بدل جاتا ہے۔مثال کے طور پر احادیث میں بعض کلمات واذکار کی فضیلت آئی ہے۔مثلاً ایک حدیث ہے:

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لو جئی بالسموات والارض ومن فیھن ومابینھن وماتحتھن فوضعن فی کفۃ المیزان ووضعت شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ فی الکفۃ الاخریٰ لرجحت بھن

اخرجہ الطبرانی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تمام آسمان وزمین لائے جائیں اور جو لوگ ان میں ہیں اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں یا ان کے نیچے ہیں، سب کا سب ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دینے کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً وہ جھک جائے گا۔

حقیقت کو مقداری اصطلاح میں بیان کرنے کا ذہن، اس قسم کی احادیث کے سلسلے میں، سب سے پہلے یہ کرتا ہے کہ "گواہی دینے" کو "پڑھنے کے معنے میں لے لیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص محبت کی تعریف میں کہے: محبت نام ہے اپنی زبان سے یہ جملہ بولنے کا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" اب اگر ایک باپ کو اپنے بیٹے سے محبت ہے تو اس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر ایک لاکھ بار محبت محبت کا ورد کر لیا کرے۔

اس کے بعد دوسری شدید تر غلطی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس ذہن کے سامنے وہ روایتیں آتی ہیں جن میں ذکر اور استغفار کے کلمات کی کثرت کی تلقین کی گئی ہے۔مثلاً فرمایا: باقیات صالحات (مریم) کو کثرت سے کہا کرو۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں۔فرمایا تکبیر، تہلیل، تسبیح، تحمید اور لاحول ولا قوۃ۔اسی طرح ایک روایت ہے:

عن ابی بکر ن الصدیق عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم بلا الٰہ الا اللہ والاستغفار فاکثروا منھا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ اور استغفار تمھارے لئے ضروری ہیں، بس ان میں کثرت کرو۔

کہنے یا شہادت دینے کو "پڑھنے" کے معنی میں لینے کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوتا ہے کہ ذکر کی کثرت " ورد کی کثرت "کے معنی میں ڈھل جاتی ہے۔اب اس کا مطلب یہ ہوجاتا ہے کہ ذکر کے مسنون اور غیر مسنون کلمات کو یاد کر لیا جائے اور ان کو تسبیح کے دانوں پر شمار کیا جاتا رہے۔ ایسے ایسے مشائخ فن پیدا ہونے لگتے ہیں جن کے ذکر کی مقدار لاکھوں سے گزر کر کروروں کی گنتی تک پہنچ جاتی ہے۔

جامع الاصول میں لکھا ہے کہ لفظ اللہ کا ذکر ورد کے طور پر کم از کم پانچ ہزار روزانہ کی مقدار ہے۔اور زیادہ کے لئے کوئی حد نہیں۔صوفیار کے لئے کم از کم پچیس ہزار روزانہ کی مقدار ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی مقدار کے متعلق لکھا ہے کہ کم از کم پانچ ہزار روزانہ ہونا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہ نے قول جمیل میں اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ میں ابتدائے سلوک میں ایک سانس میں لا الٰہ الا اللہ دوسو مرتبہ کہا کرتا تھا۔صوفیار کے یہاں ایک اصطلاح وضع ہوئی جس کو پاس انفاس کہا جاتا ہے۔یعنی اس بات کی مشق کہ کوئی سانس اللہ کے ذکر کے بغیر نہ اندر جائے نہ باہر آئے۔کروروں لوگوں نے ریاضت کرکے باقاعدہ اس کی مشق حاصل کی۔

صوفیا رذکر کے نام پر ورد کی خوب کثرت کراتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ قلب میں اس کے بعد وساوس کی گنجائش ختم ہوجائے گی۔ یہاں یہ سوال تھا کہ اوراد اور ضربوں سے اگر قلب کی اصلاح ہوتی ہے تو صحابہؓ نے اپنی اصلاح کے لئے یہ طریقہ کیوں نہ اختیار کیا۔ اس کا سادہ جواب یہ دیا گیا کہ "صحابہ کرام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے یہ قوت قلبیہ اعلیٰ درجہ پر حاصل تھی تو ان کو ضربیں لگانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جتنا بُعد ہوتا گیا اتنی ہی قلب کے لئے اس مقوی قلب خمیرہ کی ضرورت بڑھتی گئی" (۳۷)

ذکر کو ورد کے ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے بزرگی کی عجیب عجیب قسمیں وجود میں آنے لگیں۔ سرّی سقطی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جرجانی کو دیکھا کہ ستو پھانک رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ خشک ہی پھانک رہے ہو، کہنے لگے کہ میں نے روٹی چبانے اور پھانکنے کا جب حساب لگایا تو چبانے میں اتنا وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے کہ اس میں آدمی ستر مرتبہ سبحان اللہ کہہ سکتا ہے۔ اس لئے میں نے چالیس برس سے روٹی کھانا چھوڑ دیا۔ ستو پھانک کر گزر کر لیتا ہوں۔ (۲۴)

اس ذہن کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمل اور اس کے نتائج دونوں شماریاتی چیز بن گئے۔ جب گناہوں کی بھی گنتی تھی اور ذکر و استغفار کے کلمات بھی گنتی کی چیز تھے تو یہ ممکن ہوگیا کہ ایک گنتی کو آسانی دوسری گنتی سے ختم کر لیا جائے۔ ایک بزرگ لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان ان کا اہتمام کرلے، جنت میں داخل ہو اور وہ دونوں بہت معمولی چیزیں ہیں۔ مگر ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ پڑھ لیا کرے تو روزانہ ایک سو پچاس مرتبہ (پانچوں نمازوں کے بعد کا مجموعہ) ہوجائے گا اور دس گنا ہوجانے کی وجہ سے پندرہ نیکیاں حساب میں شمار کی جائیں گی۔ اور دوسری چیز یہ کہ سوتے وقت اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ، الحمد للہ ۳۳ مرتبہ، سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ پڑھ لیا کرے تو۔۔ اکلیے ہوگئے جس کا ثواب دس گنا بڑھ کر ایک ہزار نیکیاں ہوگئیں، اب ان کی اور دن بھر کی نمازوں کے بعد کی میزان کل دو ہزار پانچ سو نیکیاں ہوگئیں۔ بھلا اعمال تولنے کے وقت ڈھائی ہزار برائیاں روزانہ کس کی ہوں گی جو ان پر غالب آجائیں" (۱۳۳) "ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ کوئی شخص تم میں سے اس بات کو نہ چھوڑے کہ ہزار نیکیاں روزانہ کر لیا کرے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سو مرتبہ پڑھ لیا کرے۔ (دس گنا بڑھ کر) یہ ہزار نیکیاں ہوجائیں گی۔ اتنے گناہ تو انشاءاللہ روزانہ کے ہوں گے بھی نہیں۔ اور اس تسبیح کے علاوہ جتنے نیک کام کئے ہوں گے ان کا ثواب علیحدہ نفع میں رہا۔" (۱۳۶)

مغفرت کا معاملہ اگر اس قسم کے سادہ حساب کا معاملہ ہوتا تو صحابہ کا یہ حال نہ ہوتا کہ وہ آخرت کے خوف سے بے قرار رہتے اور یہ کہتے کہ کاش میں ایک تنکا ہوتا، کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

"من قال لا الہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ" اس قسم کی روایات کی تشریح عام طور پر جس طرح کی جاتی ہے اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاص کے ساتھ لا الہ کہنے کا مطلب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی تھوڑی دیر کے لئے کسی گوشہ میں بیٹھ جائے اور خوب احترام اور قرأت کے ساتھ ان الفاظ کی تکرار کرلے۔ اخلاص کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اخلاص قلب کے اندر ایک انقلاب پیدا ہونے کا نام ہے نہ کہ تقدس و احترام کے ظاہری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ الفاظ کو دہرانے کا۔

ذکر کے معنی عربی زبان میں یاد کے ہیں۔ اللہ کا ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ کے خوف اور اس کی محبت سے
سے اس طرح بھر جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنے محبوب ترین دوست کے لئے
بے قرار رہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دے جس کی وجہ سے بار بار کلمات شکر اس کی زبان سے
نکلتے رہیں۔ آخرت اس کو اتنی بڑی حقیقت دکھائی دینے لگے جو اس کی ساری زندگی کو بے چین کر دے اور بے تابانہ اس کی
زبان سے استغفار کی دعائیں ٹپکنے لگیں۔

ذکر نہ ورد ہے نہ تکرار الفاظ۔ یہ انتہائی واقعہ ہے جو پوری انسانی زندگی کو متاثر کر کے رکھ دیتا ہے۔ ایک حدیث میں
ہے کہ بندہ جب تکبیر (اللہ اکبر) کہتا ہے تو اس کا نور زمین سے آسمان تک سب چیزوں کو ڈھک لیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک بار خطبہ میں فرمایا، جو شخص لا الہ الا اللہ کو اس طرح کہے کہ خلط ملط نہ ہو تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔
علی بن ابی طالب نے پوچھا کہ خلط ملط کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا: دنیا کی محبت اور اس کی طلب میں لگ جانا۔ ایک بار آپؐ
نے فرمایا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا لا الہ الا اللہ کا اخلاص
کیا ہے۔ فرمایا: وہ آدمی کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یموت عبد یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ یرجع ذلک الیٰ قلب مومنٍ الا دخل الجنۃ (وعن عمر ان بلفظ) من علم ان اللہ ربہ وانی نبیہ موقنا من قلبہ حرمہ اللہ علی النار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرے کہ اس نے گواہی دی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور یہ بات اس کے قلب سے نکلی ہو، تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ (دوسری روایت میں) جو اس بات کو جان لے کہ اللہ اس کا رب ہے اور میں خدا کا رسول ہوں، اس نے قلب سے اس کا یقین کیا ہو تو جہنم کی آگ اللہ اس کے لئے حرام کر دیتا ہے۔

شیخ محمد مہدی (م ۱۸۱۵ء) مصر کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، پھر اسلام قبول کیا۔ جامعہ ازہر
میں تعلیم حاصل کی۔ اور اس کے بعد شیخ الازہر کے منصب پر سرفراز کئے گئے۔

احمد فارس شدیاق (۱۸۸۷-۱۸۰۴) لبنان کے مارونی عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اور مطالعہ کے بعد
ادبی حیثیت سے بہت نمایاں ہوئے۔ لندن کی تورات سوسائٹی نے ان کو تورات کے ترجمہ کے لئے بلایا۔ اسی طرح کے اور
بہت سے علمی اور ادبی مرتبے ان کو حاصل ہوئے۔ آخر میں تونس پہنچ کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام احمد رکھا۔

عالم عرب میں اس طرح کے بہت سے عیسائی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی کسی تبلیغی کوشش کے بغیر اسلام قبول کر لیا۔
عرب کے مسلمان اگر سیاسیات میں نہ الجھتے اور تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تو یقینی ہے کہ وہ زمین ہی ختم ہو جاتی جس پر فلسطین
اور لبنان جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو وہاں مسلمانوں کے علاوہ کئی یہودی قبیلے آباد تھے۔ آپ نے ان قبیلوں سے معاہدہ کیا۔ ان معاہدوں کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دیں گے۔ مگر انھوں نے اس کی خلاف ورزی کرکے غداری کے جرم کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔

غزوہ خندق میں بنو قریظہ نے اسی قسم کی غداری کی۔ قریش کی واپسی کے بعد مسلمانوں نے بنو قریظہ کو گھیر لیا جو اپنے قلعہ نما مکان میں محصور ہو گئے تھے۔ ۲۵ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد جب بنو قریظہ نے دیکھا کہ ان کے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا ہے تو انھوں نے ثالث مقرر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس وقت قبیلہ اوس ان کا حلیف تھا، انھوں نے خود یہ شرط پیش کی کہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ (جو مسلمان ہو چکے تھے) کو ثالث مقرر کیا جائے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے ہم کو منظور ہو گا۔ سعد بن معاذ نے تورات کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ بنو قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں اور ان کی عورتیں باندی بنالی جائیں۔

یہودیوں میں ایک شخص زبیر بن باطا قرظی تھا۔ اس نے مدینہ کے ایک مسلمان ثابت بن قیس سے جنگ بعاث کے موقع پر احسان کیا تھا۔ مدینہ کے عربوں اور یہودیوں کی اس جنگ میں ثابت بن قیس گرفتار ہو گئے تھے۔ زبیر بن باطا نے ان کو آزاد کرایا۔ ثابت بن قیس نے چاہا کہ یہودی سردار کے اس قدیم احسان کا بدلہ ادا کریں۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے ان کے کہنے پر زبیر بن باطا کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ ثابت بن قیس نے یہ خوش خبری یہودی کو پہنچائی تو اس نے کہا: میرے جیسا

کمزور، طاقت ور کے اوپر غالب آسکتا ہے

یہ قوی ہیکل جوان امریکی ہوائیہ کا ایک افسر ہے جس جس کا نام میجر رچرڈ اڈگر جانسن ہے۔ دسمبر ۱۹۷۲ میں شمالی ویٹ نام کی ایک معمولی عورت نے اس کو پکڑا اور اس کو بندوق کی نوک پر اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کر دیا۔

US Air Force Maj. Richard Edgar Johnson, a B-52 pilot, was captured by North Vietnamese militia women in Kim Anh District, Vinh Phu Province of North Vietnam.

بوڑھا آدمی، جب اس کے پاس اس کے اہل وعیال اور اس کا مال ہی نہ ہوں تو وہ اکیلا زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ ثابت بن قیس نے دوبارہ رسول اللہ سے درخواست کی تو

آپؐ نے اجازت دے دی کہ وہ اپنے اہل وعیال اور مال کو بھی لے سکتا ہے۔ مگر یہودی اس پر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اب اس نے پوچھا کہ بنو قریظہ کے دوسرے سرداروں مثلاً کعب بن اسد، حی ابن اخطب، عزال بن سموئل کا کیا حشر ہوا۔ بتایا گیا کہ وہ قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ تھا:

فلما علم انهم قتلوا قال: انی اسألك یا ثابت بیدی عندك الا الحقتنی بالقوم۔ فوالله ما فی العیش بعد هؤلاء من خیر، فما انا بصابر لله فتلة دلو ناضح حتى القى الاحبة فضربت عنقه بمشیئته

محمد حسین ہیکل، حیات محمد، قاہرہ، ۱۹۶۵، صفحہ ۳۴۰

جب اس نے جانا کہ اس کے تمام یہودی سردار قتل کر دیئے گئے، تو اس نے کہا، اے ثابت، مجھے بھی میرے لوگوں تک پہنچا دو۔ خدا کی قسم ان کے بعد اب زندگی میں کوئی بھلائی نہیں۔ کنویں کے اندر ڈول ڈالنے کی مدت کے بقدر بھی مجھے صبر نہیں، یہاں تک کہ میں اپنے دوستوں سے مل جاؤں۔ پس اس کی مرضی کے مطابق اس کی گردن ماردی گئی۔

اس غزوہ میں جو یہودی عورتیں باندی بنائی گئی تھیں، ان میں ریحانہ نامی ایک عورت رسول اللہ کے حصہ میں آئی۔ آپؐ نے اس سے کہا کہ تم اسلام قبول کر لو میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا تم عزت سے میرے ساتھ رہنا۔ مگر وہ یہودیت ترک کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ وہ آپؐ کی خدمت میں باندی کی حیثیت سے رہی اور اسی حال میں مرگئی۔

سیاست جب نشہ بن جائے

مکھن بنانے والی کوئی کمپنی اگر اپنے مکھن کی پیکنگ پر لکھ دے: "یہ مکھن صحت کے لئے مضر ہے" تو اس کا مکھن کوئی بھی شخص نہیں خریدے گا۔ ایسی کمپنی چند ہی روز میں دیوالیہ ہو جائے گی۔ مگر جدید قوانین کے تحت سگرٹ کا ہر پیکٹ جو سگرٹ ساز کمپنی سے تیار ہو کر بازار میں آتا ہے، اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے:

CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

(سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے) مگر اس سے سگرٹ کی خریداری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سگرٹ پینے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سگرٹ سازی کا کاروبار آج بھی دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار سمجھا جاتا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکھن ایک مفید غذا ہے۔ اس کو آدمی صحت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے کھاتا ہے۔ اس لئے جب کسی مکھن کی یہ حیثیت مشتبہ ہو جائے تو وہ فوراً اس کو چھوڑ دے گا۔ مگر سگرٹ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ غذائی افادیت کا کوئی تصور وابستہ نہیں۔ سگرٹ صرف نشہ حاصل کرنے کے لئے پیا جاتا ہے اور نشہ کا فائدہ سگرٹ میں اس وقت بھی پوری طرح موجود ہوتا ہے جب کہ صحت کے اعتبار سے اس کا مضر ہونا ثابت ہو گیا ہو۔ جب اصل مقصد حاصل ہو رہا ہو تو کوئی شخص کیوں اُسے چھوڑے۔ یہ معاملہ کھانے اور پینے کی چیزوں تک محدود نہیں۔ یہ کبھی دین اور مذہب تک پہنچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کچھ لوگوں کو "سیاست" کا چسکا لگ جائے تو خواہ کتنے ہی یقینی دلائل سے اس کا بے حقیقت ہونا ثابت کر دیا جائے بہر حال لوگ اس سے چمٹے رہیں گے۔ وہ کسی بھی طرح اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ دلائل کی کوئی بھی مقدار سیاست سے نشہ کی کیفیت چھین نہیں سکتی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ سیاست تمام نشہ آور چیزوں میں سب سے زیادہ نشہ کی چیز ہے۔ سگرٹ اور بھنگ کا نشہ اتر سکتا ہے۔ مگر سیاست کا نشہ کبھی آدمی سے نہیں اترتا۔ آپ دلائل کا انبار جمع کر دیجئے، تجربات اس کے بے فائدہ ہونے کا عملی ثبوت دیتے چلے جائیں۔ مگر جن لوگوں کو سیاست کا نشہ لگ گیا ہے، تخیلات کی دنیا میں بدستور وہ اپنا سیاسی رومان جاری رکھیں گے۔ موت کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے جو ان کے اور سیاست کے درمیان تفریق کرا سکے، اور اگر اتفاق سے سیاست میں کسی نے ملی ترقی کا راز دریافت کر لیا ہو یا کسی کو ایسی قرآنی ڈکشنری مل گئی ہو جس میں دین کے معنی سیاست لکھے ہوئے ہوں تو ایسے لوگوں کو سیاسی مشغلہ سے ہٹانا اتنا مشکل ہے کہ انسانی زبان میں شاید ابھی وہ الفاظ ہی وضع نہیں ہوئے ہیں جس میں اس کی دشواریوں کو بیان کیا جا سکے۔

نادانی کے اقدامات صرف غیر اسلام کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں

پاکستان تحریک میں اسلام کا نعرہ کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ اس واقعہ نے پاکستان کے اسلام پسند گروہ کو موقع دیا کہ وہ مملکت خداداد میں اپنے لئے قیادت کا ایک موافق میدان پا سکیں۔ انھوں نے نظام اسلامی کے مطالبہ کی مہم شروع کر دی ــ "پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا ہے، اس لئے یہاں اسلام کی حکومت ہونی چاہئے"۔ تاہم حقیقی صورت حال کے اعتبار سے اس نعرہ کی قیمت اس سے زیادہ نہیں تھی جتنی ہندوستان میں مسلم قائدین کے ایک گروہ کی یہ چیخ پکار کہ: "ہندوستان سیکولرزم کے نام پر آزاد کرایا گیا ہے اس لئے یہاں سیکولر راج ہونا چاہئے"۔

پاکستان اگرچہ اسلام کے نام پر بنا، مگر خود اسلام کا لفظ پاکستان میں کسی ایک چیز کا نام نہ تھا۔ اس سلسلے میں وہاں دو بڑے گروہ تھے۔ ایک انتہا پسند مسلمان۔ دوسرے لبرل مسلمان۔ عددی اعتبار سے لبرل مسلمان اکثریت میں تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ سے لے کر لیاقت علی خاں کے قتل (۱۹۵۱) اور پھر محمد ایوب خاں کے زوال (۱۹۶۹) تک مختلف انقلابات کے باوجود عملاً پاکستان میں انھیں لبرل مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہا۔

تاہم لبرل مسلمانوں کا غلبہ پاکستان میں اسلام پسند گروہ کی نفی کے ہم معنی نہیں تھا۔ وزارت سازی کے باہر زندگی کے تمام مواقع ان کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ تحقیق و تعمیر اور دعوت و اشاعت کے تمام میدانوں میں وہ بے روک ٹوک اپنا کام جاری رکھ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خود حکومت کے تعاون سے ایک ایسا اسلامی مرکز قائم کر سکتے تھے جو نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا میں دعوت حق اور تعمیر افکار کا کام اعلیٰ ترین سطح پر انجام دیتا۔ اسلامی گروہ کے لئے حقیقت پسندانہ طریق کار یہ تھا کہ وہ لبرل مسلمانوں سے سیاسی تصادم نہ کرتے ہوئے دوسرے ممکن مواقع کو اپنے استعمال میں لاتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پاکستان میں اپنی جڑیں اس حد تک مضبوط کر سکتے تھے کہ بالآخر وہ جمہوری طریقہ کے مطابق وہاں غالب آ جاتے۔ مگر انھوں نے قبل از وقت سیاسی ٹکراؤ میں بہترین ۳۰ سال ضائع کر دیئے۔ یہاں تک کہ مسئلہ پہلے سے زیادہ گمبھیر ہو گیا۔

پچھلے برسوں میں جب کہ پاکستان میں انتہا پسند مسلمانوں اور لبرل مسلمانوں کے درمیان اقتدار کی کش مکش جاری تھی ٹھیک اسی وقت وہاں ایک اور مسئلہ پرورش پا رہا تھا۔ یہ مہاجرین اور غیر مہاجرین کا مسئلہ تھا۔ دلّی، یو۔پی، بہار وغیرہ کے مسلمان جو پاکستان تحریک میں بہت زیادہ پیش پیش تھے، ہجرت کر کے پاکستان گئے۔ یہ لوگ اس احساس کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوئے تھے کہ "پاکستان ہم نے بنوایا ہے"۔ قدرتی طور پر ان کی نفسیات یہ تھی کہ پاکستان میں زبان اور تہذیب سے لے کر سیاسی اور اقتصادی امور تک ہر جگہ ان کو غلبہ ملنا چاہئے۔ مہاجرین کی یہ ذہنیت غیر مہاجرین کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ دونوں میں ہر محاذ پر کش مکش شروع ہوئی جو دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

یہ کش مکش جب سماجی سطح پر اپنا حل نہ پا سکی تو اس کے بعد اس نے سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ غیر مہاجرین کے پاس اپنے موقف کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اگر علاقائی نعرے

تھے تو مہاجرین نے نہایت آسانی کے ساتھ آفاقی اسلام میں اپنے موافق نعرے تلاش کر لئے۔ غیر مہاجرین نے سوشلزم اور نیشنلزم کے سایہ میں پناہ لی۔ دوسری طرف مہاجرین اسلام کے علم بردار بن کر کھڑے ہو گئے۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے زوال (۱۹۷۷) کے بعد یہ پولرائزیشن اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکا ہے۔ اب پاکستان کی سیاست مہاجرین اور غیر مہاجرین کی سیاست ہے نہ کہ حقیقۃً اسلام اور غیر اسلام کی سیاست۔

اس طرح پاکستان کی سیاسی لڑائی، اسلام پسند طبقہ کی مسلسل نادانیوں کے نتیجہ میں، اب شدید تر مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے۔ جو تقسیم پہلے انتہاپسند مسلمان اور لبرل مسلمان کے نام سے تھی، اب اس نے مہاجر اور غیر مہاجر کی تقسیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دوسرے لفظوں میں نظریاتی اختلاف کے ساتھ نسلی اور اقتصادی عصبیتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ بدقسمتی سے اب بھی یہی دوسرا گروہ (غیر مہاجرین) اکثریت میں ہیں۔ لیاقت علی خاں (۱۹۵۱ — ۱۸۹۸) اور محمد ایوب خاں (۱۹۷۴ — ۱۹۰۷) کے زمانہ میں اگر کسی درجہ میں اسلام کے نفاذ کا امکان تھا تو اب وہ ضد اور تعصب کے نتیجہ میں بالکل برباد ہو چکا ہے۔ اب تقریباً یقینی ہے کہ پاکستان میں یا تو الکشن نہیں ہوگا اور فوجی افسران بدستور اقتدار پر قابض رہیں گے۔ اور اگر کبھی الکشن ہوا تو لازماً بھٹو پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی۔ خواہ اس پر بدعنوانی اور غداری کا کتنا ہی الزام لگایا جائے۔ حتیٰ کہ اگر مسٹر بھٹو کو قتل کر دیا جائے جب بھی عملاً جو فرق ہوگا وہ صرف یہ کہ کوئی "بے نظیر"، یا غیر بے نظیر جو مسٹر بھٹو (بالفاظ دیگر اینٹی مہاجر تحریک) کی علامت بن کر ابھرے گا، پاکستان کی اکثریت کا ووٹ اس کے حصہ میں جائے گا۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ علاقہ ہو سکتا ہے جس کی سرحدیں افغانستان سے ملی ہوئی ہیں۔ اگر پاکستان میں دوبارہ جمہوری حالات پیدا ہوئے تو یہ علاقہ خان عبد الولی خاں کی قیادت میں غالباً وہی راستہ اختیار کرے گا جو اس سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں سابق مشرقی پاکستان نے اختیار کیا تھا۔

آہ اسلام کے وہ علم بردار جو اپنی بے دانشی کے نتیجہ میں صرف غیر اسلام کے لئے راہ ہموار کرنے کا سبب بن جائیں۔

سرحد پار سے آنے والی خبروں سے اندازہ ہوتا

ایک خاندان کے یہاں دوسرے فرقہ کا ایک آدمی ملازم تھا۔ اس نے چوری کی۔ نوجوان صاحبزادے جوش میں اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ باپ نے منع کیا۔ "تم چوری کے لئے اس کو مارو گے"، باپ نے کہا "اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ، فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ، کھڑا ہو جائے گا۔" اب گھر کے لوگ مارنے سے رک گئے اور مسئلہ کو حکمت کے ساتھ حل کیا۔

"حکمت عملی" کا یہ راز جو ایک معمولی آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں پا لیتا ہے، اس کو پاکستان کے رہنما اسلامی تحریک کے معاملہ میں نہ جان سکے۔ وہ صورت حال کے تمام پہلوؤں کا اندازہ کئے بغیر بار بار ایسے اقدامات کر رہے ہیں کہ اصل مقصد (اسلامی نظام کا قیام) تو حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ ہنگامہ کے نتیجہ میں کچھ دوسرے شدید تر مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نئی نئی پیچیدگیاں ابھر کر راستہ کی مشکلات کو کچھ اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں ——— مجیب ازم (بنگالیت) بھٹو ازم (پاکستانی نیشنلزم) ولی ازم (سرحدی علاقائیت) وغیرہ سب اسی قسم کے نادان اقدامات کے پیدا شدہ نتائج ہیں۔ "چوری"، ختم نہیں ہوتی۔ البتہ "فرقہ وارانہ فسادات"، نئے نئے عنوان سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ سیاست اور کیسے عجیب ہیں یہ خادمانِ اسلام۔

ہے کہ موجودہ فوجی حکمران مسٹر بھٹو کی مقبولیت سے بے حد خائف ہیں۔ وہ مارشل اصغر خاں کو آگے بڑھا رہے ہیں تاکہ اگر الیکشن کرانا پڑے تو مسٹر بھٹو کے بجائے مارشل اصغر خاں کو اوپر لایا جا سکے جو اپنی کمتر صلاحیت کی بنا پر فوجیوں کے لئے نسبتاً کم درجہ کا خطرہ بن سکتے ہیں۔ جہاں تک نو جماعتوں کے متحدہ اسلامی محاذ کا سوال ہے وہ اپنے آپ ختم ہو رہا ہے کیونکہ اس اتحاد کی بنیاد محض منفی جذبات پر تھی اور منفی بنیادوں پر قائم ہونے والا اتحاد دیر تک باقی نہیں رہتا۔

مذکورہ بالا تجزیہ سے اگر پورا اتفاق نہ کیا جائے، جب بھی یہ بات یقینی ہے کہ پاکستان میں جو سیاسی مسئلہ ہے وہ حقیقتاً اسلام بمقابلہ ایوب یا اسلام بمقابلہ بھٹو نہیں ہے۔ بلکہ اسلام بمقابلہ لبرلزم ہے اور اسلام کا یہ حریف اس وقت بھی پوری طرح باقی رہتا ہے جب کہ ایوب یا بھٹو کو ختم کر دیا گیا ہو۔

مسٹر بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے پاکستان کو بہت بڑی قیمت دینی پڑی ہے۔ مگر اس کے باوجود اصل صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ فوج بالفرض اپنی بیرکوں میں واپس چلی جائے اور دوبارہ پاکستان میں جمہوری طرز پر حکومت بنے، جب بھی عملاً جو فرق ہوگا وہ صرف یہ کہ لبرل اسلام کو ماننے والی اکثریت پہلے اگر ایوب اور بھٹو کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئی تھی تو اب وہ کسی "مارشل اصغر خاں"، یا کسی "عبدالولی خاں"، کو اپنی نمائندگی کے لئے پالے گی۔ جہاں تک اسلامی قانون کے علم برداروں کا تعلق ہے، ان کا بیلٹ بکس بدستور خالی رہے گا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۷۷

اور ہمارے عوامی حکمراں!

ROYAL FARE FOR RICKSHAW-PULLER

KATHMANDU, Nov 10.—King Birendra and Queen Aishwarya rode a cycle rickshaw through the border town of Birgunj, in eastern Nepal, says Samachar.

An English daily, Motherland, yesterday reported that as the tired rickshaw-puller was calling it a day after paltry earnings, he found a young couple briskly walking across the road and boarding his rickshaw.

The passengers wanted to see the town and the rickshaw-puller was too pleased to show the "tourists" around. He explained the various landmarks to them and talked about his hopes to earn a lot of money.

After half-an-hour's ride the passengers got down and the rickshaw-puller stared in disbelief when he was paid Rs 2,000 as fare.

The Motherland reported that the King often travelled incognito to study the problems of the poor.

بیرگنج، نیپال کا ایک قصبہ ہے جو ریاست کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ نیپال کے مہاراجہ اور مہارانی یہاں حفاظتی عملہ یا افسروں کے غول کے بغیر تنہا گھومتے رہے۔ ان کی سواری ایک معمولی سائیکل رکشا تھا۔ غریب رکشے والا دن بھر کا تھکا ہوا اپنی معمولی کمائی پر افسردہ چلا جا رہا تھا کہ ایک جوڑے نے اس کو روکا، جو سڑک کے کنارے پیدل چل رہا تھا اور اس پر سوار ہو گئے۔

دونوں سواروں نے شہر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور رکشے والا ان "سیاحوں"، کو خوشی خوشی قصبہ کی سیر کراتا رہا۔ اور مختلف مقامات کے بارے میں ان کو بتاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ کی سواری کے بعد دونوں مسافر رکشے سے اتر گئے۔ رکشے والے کو اس وقت سخت حیرانی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ دونوں مسافروں نے اسکو کرایہ کے طور پر دو ہزار روپے دیئے ہیں۔ مہاراجہ نیپال کے لئے یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ وہ اکثر اسی طرح بھیس بدل کر ریاست کے مختلف مقامات پر جاتے ہیں تاکہ غریب عوام کے مسائل کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

"یہ حسین خطے شاید زمین پر اس لئے رکھ دیئے گئے ہیں''، میں نے اپنے دل میں کہا "کہ انسان دوسری زندگی میں بننے والی جنت کا تصور کرسکے"۔ میں کشمیر کی ایک حسین وادی میں کھڑا تھا۔ مخملی سبزہ کا فرش، چشمہ کی موسیقی، درختوں کی قطاریں، پہاڑوں کے مناظر اور ان کے آگے آسمان کا آفاقی پس منظر، ان تمام چیزوں نے مل کر میرے سامنے کی دنیا کو اتنا خوبصورت بنا دیا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں جنّت کی کوئی جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ "کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا کی بہشت میں جگہ ملے۔ اور کتنے بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس سے محروم کر دیئے جائیں"۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ایک طرف دہکتے ہوئے ستارے رکھ دیئے ہیں تاکہ آدمی جہنم کا تصور کرسکے اور دوسری طرف کشمیر جیسے حسین قطعات ہیں جو گویا ہمیں جنت کی ایک جھلک دکھا رہے ہیں۔ ستاروں کا الاؤ ہم کو خدا کی ہولناک پکڑ سے لرزاتا ہے۔ اور زمین کے خوبصورت ٹکڑے ہم کو خدا کی جنت کی یاد دلا کر اس کی رحمتوں اور نعمتوں کی طرف دوڑنے کا شوق دلاتے ہیں۔ اگر آدمی آنکھ کھول کر زندگی گزارے تو یہی دنیا اس کو جنت اور جہنم کا نقشہ دکھانے کے لئے کافی ہے۔ مگر جنھوں نے غفلت اور سرکشی سے اپنی بینائی کھو دی ہو، ان کو کوئی چیز بھی دکھائی دینے والی نہیں۔ نہ جنت نہ جہنم۔

کشمیر کے قدرتی مناظر اس سے زیادہ حسین ہیں کہ کوئی شخص ان کو لفظوں میں بیان کرسکے۔ کیمرہ اس کے بعض پہلوؤں کا عکس لے سکتا ہے مگر قلم کے ذریعہ ان کی تصویر کشی ممکن نہیں

کشمیر میں تین ہفتے

اسلامک اسٹڈی سرکل جموں وکشمیر کی دعوت پر کشمیر کے سفر کا اتفاق ہوا اور ان کے سالانہ اجتماع (یکم-۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء) میں شرکت ہوئی۔

۱۸-۱۹ ستمبر کا دن جموں میں گزرا۔ جو دلی سے چھ سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ۱۹ ستمبر کی شام کو سری نگر پہنچا اور ۱۱ اکتوبر تک کشمیر میں قیام رہا۔ ریاست جموں و کشمیر دو مختلف جغرافیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جموں اونچا نیچا پہاڑی علاقہ ہے۔ اس کے راستے کافی دشوار گزار ہیں۔ اس کے برعکس وادی کشمیر بڑی حد تک ایک مسطح علاقہ ہے سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تقریباً دو سو کیلومیٹر لمبا اور ڈیڑھ سو کیلومیٹر چوڑا میدان اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ہے۔ وادی کشمیر ایک طرف حسین اور شاداب پہاڑی علاقہ ہے، دوسری طرف وہ اپنے اندر میدانی خصوصیات بھی پوری طرح رکھتا ہے۔

کشمیر میں جن مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا، وہ حسب ذیل ہیں:

جموں، سری نگر، گلمرگ، سوپور، بارہ مولہ

سری نگر میں شالیمار، نشاط باغ، چشمہ شاہی، ڈل جھیل وغیرہ دیکھی۔ درگاہ حضرت بل اور دوسری بڑی بڑی زیارتوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مغلوں نے کشمیر میں جو باغات بنائے، وہ آج بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ چار سو برس پہلے وہ اتنی عظیم منصوبہ بندی تک کیسے پہنچ سکے۔

کشمیر کے لوگوں کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ عام طور پر وہ اتنے ہی عمدہ ہوتے ہیں جتنا کہ خود کشمیر۔ محنت، سادگی، مذہبیت کے مجموعہ کا نام کشمیری ہے جس پر مزید اضافہ ان کی فطری ذہانت ہے۔ مگر اس قیمتی انسانی گروہ کی سب سے بڑی کمزوری، خاص طور پر مسلمانوں کی، ان کا علم میں پیچھے ہونا ہے۔ علم و شعور میں پیچھے ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان صرف دو چیزیں فروغ پاتی ہیں: توہماتی مذہب یا جذباتی سیاست۔

حالیہ برسوں میں، خاص طور پر شہروں میں، سیکولر تعلیم کی طرف کافی رجحان بڑھا ہے۔ تاہم دینی تعلیم کی طرف ابھی کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ میرا خیال ہے کہ ایک عربی دینی درس گاہ کا قیام یہاں کی شدید ترین ضرورت ہے۔

دوسری چیز یہ کہ کشمیر ایک سیاحتی ریاست ہے۔ یہاں ساری دنیا سے مسلسل سیاح آتے رہتے ہیں۔ کشمیر گویا ایک قسم کی عالمی زیارت گاہ ہے۔ اس صورت حال نے کشمیر کو ایک قدرتی پلیٹ فارم بنا دیا ہے جہاں سے عالمی سطح پر دعوت حق کا کام کیا جا سکتا ہے۔

کشمیر میں جماعت اسلامی نے دینی اصلاح کا کافی کام کیا ہے۔ خاص طور پر یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں دینی رجحان پیدا کرنے کا کریڈٹ زیادہ تر اسی کو جاتا ہے۔ تاہم حال میں الکشنی سیاست کی طرف جھکاؤ نے مختلف پہلوؤں سے اس کے کام کو متاثر کیا ہے۔ اگر جماعت اسلامی یہاں الکشنی سیاست سے اپنے کو بچا سکے تو کشمیر میں دینی احیاء کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دے سکتی ہے۔

کشمیر میں اسلام کا آغاز غالباً محمد بن قاسم کے زمانہ میں دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ اس کے بعد مختلف بزرگ یہاں اسلام کی روشنی پھیلاتے رہے۔ سات سو سال پہلے

کشمیر میں ایک بودھ راجہ تھا جس کا نام رینچن شاہ تھا۔ یہ راجہ حضرت بلبل شاہ کے ذریعہ مسلمان ہوا۔ اس زمانے میں لوگ اپنے سرداروں اور بادشاہوں کے دین پر ہوتے تھے۔ چنانچہ راجا کو دیکھ کر بہت سے کشمیری مسلمان ہو گئے۔ بلبل شاہ صاحب فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔

چنانچہ اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے، وہ ان کے اثر سے حنفی مسلک کے مطابق عبادت کرنے لگے۔

کشمیر میں اسلام پھیلانے کا کام سب سے زیادہ میر سید علی ہمدانی (۱۳۸۴ — ۱۳۱۴ء) کے ذریعہ ہوا، جن کو کشمیر میں "امیر کبیر" کہا جاتا ہے۔ سری نگر میں ان کی زیارت "خانقاہ معلی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جہلم کے کنارے ۱۳۹۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ موصوف جب ایران سے کشمیر آئے تو اس وقت یہاں جو مسلمان تھے، وہ حنفی مسلک پر عامل تھے جب کہ موصوف خود شافعی المسلک تھے۔ موصوف نے یہاں فقہی مسالک کی کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ اس کی وجہ سے انھیں کشمیر میں کام کے بہت مواقع ملے۔ انھوں نے یہاں تک احتیاط کی کہ جو لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے ان کو بھی، عام مسلمانوں کے طریقے کے مطابق، حنفی مسلک کے مطابق عبادت کرنے کی تلقین کرتے۔ اپنا شافعی مسلک ان سے پوشیدہ رکھتے۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں ان کو زبردست کامیابی ہوئی۔ بے شمار لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اگر وہ حنفی مسلک اور شافعی مسلک کی بحثیں چھیڑتے تو ناممکن تھا کہ ان کو یہ کامیابی حاصل ہوتی اور بالفرض کوئی کامیابی ہوتی تو وہ بھی اس قیمت پر کہ کشمیر میں ان کی آمد کشمیری مسلمانوں کو دو متحارب فریقوں میں بانٹ دینے کا سبب بن جاتی۔

کشمیر میں زیارت گاہیں سینکڑوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ زیارت گاہیں جن بزرگوں کی طرف منسوب ہیں اُن کے بارے میں عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ بالکل اَن پڑھ تھے۔ وہ بستی سے دور ایک جنگل میں چلے گئے۔ وہاں ایک کھوہ میں عبادت و ریاضت کرتے تھے۔ ان کی مقبولیت دیکھ کر "ملّا" لوگوں کو خیال ہوا کہ انھیں زک پہنچائیں۔ وہ ایک وفد کی صورت میں مذکورہ بزرگ کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ ہم آپ سے کچھ مسائل پوچھنے کے لئے آئے ہیں۔ بزرگ نے کہا میں تو ان پڑھ ہوں۔ ملّا لوگوں نے کہا، خواہ کچھ ہو، آپ کھوہ سے باہر آیئے اور ہمارے سوالات کا جواب دیجئے۔ بزرگ نے کہا اچھا ایک کوئلہ لاؤ۔ کوئلہ لایا گیا۔ انھوں نے اس کو منھ میں رکھ کر چبایا اور پھر اس کو ایک پتھر پر پھینک دیا۔ ملّا لوگوں نے دیکھا تو پتھر پر ان تمام سوالات کے جوابات لکھے ہوئے تھے جو وہ اپنے ذہن میں لے کر آئے تھے اور ابھی بزرگ موصوف کو بتایا بھی نہیں تھا۔

اس قسم کے بے شمار طلسماتی قصے کشمیریوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جیسا کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان بے بنیاد قصوں نے نہ صرف دین کی حقیقت کو مسخ کر دیا ہے، بلکہ قوم کی فکری سطح کو انتہائی حد تک پست کر دیا ہے۔

کشمیر کو قدرت نے عجیب و غریب نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ گویا ایک جغرافی گلدستہ ہے جو حسین مناظر اور زندگی بخش قوتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ یہاں کے امکانات ابھی تک غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں — یہاں ایسے جھرنے اور آبشار ہیں جن سے بڑے بڑے برقابی منصوبے چلائے جا سکتے ہیں۔ مگر کشمیر اب بھی پنجاب سے بجلی خریدتا ہے۔ یہاں بہترین چراگاہیں ہیں جہاں ڈیری کی صنعت اور شہد کی مکھی پالنے کا کام بڑے پیمانہ پر

کیا جاسکتا ہے، مگر دودھ بڑی مقدار میں باہر سے آتا ہے۔
یہاں کا موسم ایسا ہے کہ گھر گھر ریشم کا کیڑا پالا جاسکتا ہے اور اس سے کافی نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حکومت نے حال میں اس سلسلے میں شہتوت کے باغات لگائے ہیں اور کیڑے فراہم کرنے کی سہولت دی ہے۔ گھر کے اندر معمولی انتظام سے کیڑے اور شہتوت کے پتے رکھ کر یہ کام کیا جاسکتا ہے مگر بہت کم کشمیری ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔ یہاں کی تجارتوں میں زیادہ تر روایتی تجارتیں ہی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ مثلاً شال، قالین، آرائشی سامان وغیرہ۔ مگر بڑے بڑے کاروبار، ایجنسیاں اور جدید تجارتیں عام طور پر دوسروں کے ہاتھ میں ہیں۔

یہاں کے مسلمان، دوسرے علاقہ کے مسلمانوں کی طرح، نعروں اور تقریروں کی سیاست میں "شیر کشمیر" بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مدفون بزرگوں کی کرامتوں کا حال یہ ہے کہ آج بھی وہ حیرت انگیز حد تک عالم اسباب پر حکمرانی کر رہے ہیں مگر انھیں مسلمانوں کو حقیقی عملی زندگی میں دیکھئے تو وہ خود اپنے اکثریتی علاقہ میں ہر اعتبار سے دوسرے درجے کی قوم نظر آئیں گے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تاریخ کو دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ غالب حیثیت میں ہیں وہاں بے معنی سیاست بازی، اور جہاں غالب حیثیت میں نہیں ہیں وہاں بے معنی فریاد و احتجاج۔ کشمیر کے مسلمان دونوں حالتوں کے درمیان ہیں اس لئے وہاں کسی صحت مند اسلامی تحریک کے مواقع دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پورے برصغیر میں کشمیر موزوں ترین مقام ہے جہاں سے کسی مؤثر دینی کام کا آغاز کیا جاسکے۔ اگرچہ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں کسی ایسے عمل کا آغاز ہو چکا ہے یا مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔

کشمیر کے تین ہفتہ قیام میں کثرت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور دینی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ غیر رسمی قسم کے اجتماعات تقریباً روزانہ ہی جاری رہے۔ باقاعدہ اجتماعات جن میں خطاب کا موقع ملا، وہ حسب ذیل تھے:

۳۰ ستمبر کشمیر یونیورسٹی ہاسٹل میں ایم۔اے اور ریسرچ کے طلبہ، موضوع "مذہب اور سائنس"

۲ اکتوبر اسلامک اسٹڈی سرکل کے سالانہ اجلاس میں، "احیائے اسلامی کے جدید امکانات"

۳ اکتوبر اسلامک اسٹڈی سرکل کے سالانہ اجلاس میں، "اسوۂ رسول"

۴ اکتوبر گورنمنٹ ڈگری کالج، سوپور۔
RELIGION AND SCIENCE: A CONCORDANCE

۴ اکتوبر صوفی اسٹور سوپور کے مکان پر، "سیرت سے کیا سبق ملتا ہے"

۵ اکتوبر مسجد نور باغ بارہ مولہ، درس حدیث۔

۶ اکتوبر کشمیر یونیورسٹی سری نگر، مذہب اور سائنس۔

۶ اکتوبر شعبۂ تعلیمات کشمیر، ہرسٹی، تعلیم اور اخلاقیات۔

۷ اکتوبر لالہ رُخ ہال، سری نگر، اسلام اور جدید تحقیقات۔

۸ اکتوبر اسلامیہ کالج آف سائنس اینڈ کامرس، سری نگر، "اسلام اور عصر جدید"

۹ اکتوبر بارہ مولہ (جامع مسجد) "اسلام کا پیغام سیرت کی روشنی میں"

کشمیر کے مختلف مقامات سے تقاضے جاری تھے۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ میں مزید قیام کروں اور مختلف مقامات کا سفر کرکے وہاں اجتماعات کو خطاب کروں۔ مگر مزید ٹھیرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ ۱۲ اکتوبر کو میں دہلی واپس آگیا۔

آزادی سے قبل اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر ریاستوں کی اندرونی خودمختاری کے خلاف تھے۔

اور کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان ابتداءً ایک بڑا اختلافی نکتہ یہی تھا جو بالآخر دونوں کے درمیان تفریق کا سبب بنا تاہم آزادی کے بعد حالات کے دباؤ نے ان کو اس معاملہ میں نرم ہونے پر مجبور کر دیا۔ مرکز۔ ریاست تعلقات کے موجودہ ڈھانچہ میں ملک کی ایک ریاست کو اندرونی طور پر کافی اختیارات دیئے گئے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے عوام کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ جموں و کشمیر کو اس سلسلہ میں مزید خصوصیت حاصل ہے کیونکہ دستور کی دفعہ ۳۷۰ نے اس سرحدی ریاست کو خصوصی درجہ (SPECIAL STATUS) عطا کیا ہے جو کسی دوسری ریاست کو حاصل نہیں ہے۔ ۶ نومبر ۱۹۷۷ کو جموں و کشمیر کی حکومت نے جو آرڈی ننس جاری کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے ایک اخبار نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے:

IT IS POSSIBLE, INDEED PROBABLE, THAT, THANKS TO KASHMIR'S SPECIAL POSITION UNDER ARTICLE 370 OF THE CONSTITUTION, WHAT IS UNLAWFUL ELSEWHERE IN THE COUNTRY MAY BE HELD TO BE VALID THERE.

The Times of India, 8.11.77

یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ کشمیر کو دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت جو خصوصی درجہ حاصل ہے، اس کی وجہ سے ایسا ہو کہ جو چیز دوسری ریاستوں میں بے ضابطہ ہے، وہ یہاں ضابطہ کے مطابق قرار پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جموں و کشمیر کی حکومت دوسری ریاستوں کی حکومتوں سے کہیں زیادہ اس حیثیت میں ہے کہ وہ اپنے عوام کی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کر سکے۔ اسی بنا پر ہم نے پندرہ سال پہلے کشمیری دوستوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ "حقیقت پسندانہ سیاست" کا طریقہ اختیار کریں۔ مگر اس وقت کشمیر سیاسی جوش و خروش کا طوفان

ڈل جھیل کی تفریحی کشتی "شکارا" میں بیٹھے ہوئے — "یہاں ہم کو خصوصی درجہ کا لطف حاصل ہے"

بنا ہوا تھا۔ ہماری بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ حقیقت پسندی اور سیاست ان کے یہاں شاید دو متضاد چیزیں تھیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔

کسی نے کہا ہے: "سیاست ممکنات کا کھیل ہے نہ کہ ناممکن چیزوں کے پیچھے دوڑنے کا"۔ بدقسمتی سے مسلم قائدین کے نزدیک سیاست اس کے برعکس چیز کا نام رہی ہے۔ خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے نزدیک تو سیاست کا واحد مطلب یہ ہے کہ ساری عمر ناممکن چیزوں کے پیچھے دوڑتے رہو اور جو چیز آج ممکن ہے اس کو استعمال کرنے سے کوئی غرض نہ رکھو۔ مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اس لاحاصل مشغلہ کو وہ جہاد اور قربانی کے پُرفخر ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔

تاہم ۳۰ قیمتی سال ضائع کرنے کے بعد شاید کشمیریوں کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہوا ہے۔ موجودہ حکومت نے عوام کی بہبود کے بہت سے اقدامات شروع کئے ہیں۔ اوقاف کے وسیع ذرائع کو از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سری نگر کے حالیہ سفر میں میں نے دیکھا کہ قدیم شہر کی سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر مکانات گرائے جارہے ہیں۔ مگر مکان کے مالکوں کو اس سلسلہ میں حکومت سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ حکومت اس کا اتنا معقول معاوضہ دے رہی ہے جو ان کے نقصان کی پوری تلافی کردیتا ہے۔ نوجوان نسل میں تعلیم کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ تجارتوں میں بھی لوگ داخل ہورہے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم "اسلامک اسٹڈی سرکل" نے اپنے دستور میں ترمیم کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ خالص "غیر سیاسی دائرہ" میں دعوتی اور تعمیری کام کرے گی۔ وغیرہ

کشمیر کے غالب فکر کے مقابلہ میں یہ چیزیں ابھی بہت کم ہیں۔ تاہم یہ نیا ذہن اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو عجب نہیں کہ یہاں کے لوگ اگلے ۳۰ سال میں وہ چیزیں حاصل کرلیں جس کو پچھلے ۳۰ سال میں وہ صرف کھوتے رہے ہیں۔

صرف پندرہ منٹ میں

ٹائم میگزین (نیویارک) کے دفتر میں یہ قاعدہ ہے کہ مضامین پریس میں جانے سے پہلے ایک مخصوص اسٹاف کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ وہ ان میں مندرج تمام حقائق کو باریک بینی کے ساتھ جانچتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ماہرین کی ایک ٹیم مقرر ہے جس کے پاس ایک مکمل قسم کی ریفرنس لائبریری مہیا کی گئی ہے۔

میگزین کی ایک اشاعت (۸ اپریل ۱۹۷۴) میں صفحہ اول کا مضمون (COVER STORY) افراطِ زر پر تھا جس کا عنوان تھا:

WORLD INFLATION

ٹائم کا یہ مضمون پریس جانے سے پہلے حسب قاعدہ مذکورہ اسٹاف کے پاس پہنچا۔ اس مضمون میں ایک بات یہ تھی کہ قدیم لیڈیا کے باشندوں (LYDIANS) نے پہلی بار دھات کے سکے بنائے۔ متعلقہ کارکن نے اس کو لائبریری کے محققین کے پاس بھیجا کہ وہ اس کی تحقیق کریں۔ انھوں نے تین انسائیکلوپیڈیا کو دیکھا تو تینوں میں مختلف بیانات تھے۔ پھر انھوں نے تاریخ زر (HISTORY OF MONEY) پر دو اہم ٹکسٹ بک سے رجوع کیا اور بالآخر اپنے فیصلہ سے متعلقہ کارکن کو مطلع کیا۔ اس پورے عمل میں صرف پندرہ منٹ لگے!

ٹائم میگزین (نیویارک) ۸ اپریل ۱۹۷۴

قوموا لقضايا الحياة الابدية

لو شوهدت الافعى فى بيت من البيوت فستجد كل كبير وصغير يهب لقتلها بالعصى والاحجار ، ولكنهم لا يقبلون على العمل البناء الصامت بمثل هذه الحركة • وهذا ما ينطبق على الحركات الاسلامية المعاصرة • فهى لم تقم لاجل فكر اسلامى ايجابى ، بل قامت ردا على عوامل خارجية محضة ، كاعتداء شعوب الغرب على أوطاننا ، والعدوان الاسرائيلى والمذابح الطائفية والخسارة السياسية أو الاقتصادية • وأصبحت حركات رد الفعل على هذه الاحداث تسمى بالحركات الاسلامية •

● وهناك فروق شاسعة بين هذه الحركات نفسها ، فمنها حركات متطرفة ، واخرى تظهر بالثوب الفلسفى ،وبعضها ينادى بالقرآن والاسلام ، بينما البعض الاخر ينادى بالقومية والوطن ، وبعضها ينادى بالهجوم ، واخرون ينادون بحفظ الحقوق • ولكن هناك قاسما مشتركا بين كل هذه الحركات ، وهو ان الدافع المحرك لها كلها ليس الاالاحداث الدنيوية الخارجية ، وليست رسالة الاسلام الابدية •

● ان للانسان قضية ابدية واحدة فى نظر الاسلام ، والمسلم دائما يقوم لها وحدها، ألا وهى قضية الاخرة • ان الخالق لم يخلق الانسان كالاشجار والطيور والحيوانات، بل خلقه كمخلوق مسئول • وما الحياة الدنيا الا فترة امتحان واختبار • والانسان لا ينتهى حين يعبر بوابة الموت، بل هو يمثل بين يدى ربه للحساب عن حياته الدنيوية • وبعد ذلك تبدأ الحياة الابدية ، فى الجنة أو الجحيم ، حسب أعمال كل فرد على حدة •

● والحركة الاسلامية تقوم لانذار البشر بهذه القضية البالغة الخطورة • ان المسلم لا يصوغ فكره بالانفعال مع القضايا الدنيوية المؤقتة ، بل هو يصوغ فكره فى ضوء حقائق الحياة الابدية • ان المسلم يصبر على المصائب الخارجية حتى لا ينصرف عن رسالته الحقيقية • انه ينفق كل طاقاته لهدف واحد لانه يعرف جيدا ان كل الابواب الاخرى ستنفتح له بتادينه هذه المسئولية الاساسية •

ان المسلم يعمل لاجل قضايا الحياة الابدية وليس لاجل القضايا المؤقتة • وحين يواجه الانسان قضايا الحياة الابدية البالغة الخطورة ، فالاحمق وحده يستطيع ان يصرف طاقاته للقضايا المؤقتة •

● **ان رسالة الامة المسلمة ان تنذر البشر بيوم الاخرة • ولو فتحنا الصراع مع الاخرين لاجل القضايا الدنيوية فسنقضى على الجو الذى يتيح لفت انظارهم نحو القضايا الاخروية •**

ان الدعوة التى تصاحب الصراعات السياسية والاقتصادية ليست من الدعوة فى شىء ، بل هى مسرحية ساخرة !

بقلم المفكر الهندى :

وحيد الدين خان

الجمعة ١٠ من شوال ١٣٩٧ هـ
Sept. 23, 1977

ماہنامہ الرسالہ کے تذکرے عرب اخبارات میں ہونے لگے ہیں یہاں الاسبوع الثقافی (طرابلس) کے ایک مضمون کا چربہ نقل کیا جاتا ہے۔ اس اخبار نے الرسالہ کے ایک مضمون کا عربی ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ مضمون الرسالہ ماہ مارچ ۱۹۷۷ کے صفحہ ۴۶ پر شائع ہوا تھا، اور اس کا عنوان تھا: "زندگی کے ابدی مسائل کے لئے اٹھئے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے"
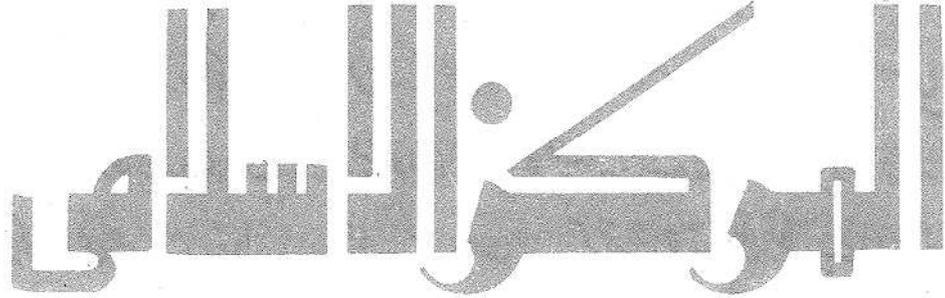
A L - M A R K A Z - U L - I S L A M I (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

۵۹

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اُخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک مہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جاسکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالات صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے
خطوط وغیرہ پر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6